وہ یقین کا
نیا سفر
www.iqbalkalmati.blogspot.com
فرحت اشتیاق

مکمل ناول

"ڈاکٹر زوبیہ خلیل! آپ یہاں پر جاب کیوں کرنا چاہتی ہیں؟"

پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل خاموش بیٹھے اس بے پناہ بارعب شخصیت کے مالک بندے نے اچانک سوال کیا تھا۔ انٹرویو بورڈ میں بیٹھے تین افراد میں سے مسلسل دو ہی افراد اس سے سوالات کر رہے تھے۔ اس نے چونک کر وضاحت طلب نظروں سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آخر ایسی کیا وجہ ہے جو آپ پشاور چھوڑ کر اس دور افتادہ بستی میں جاب کرنا چاہتی ہیں؟" اس نے خود ہی اپنی بات کی وضاحت کر دی تھی۔

یہ اس کی زندگی کا پہلا انٹرویو نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے بے شمار جگہوں پر انٹرویو دے چکی تھی۔ ملازمت کرنا بھی نیا تجربہ نہیں تھا۔ مگر یہاں اپنے بالکل سامنے اس وسیع و عریض میز کے پیچھے بیٹھے اس بندے میں پتا نہیں ایسی کیا بات تھی کہ وہ تھوڑی سی نروس ہو گئی تھی۔ حالانکہ وہ اس قسم کے سوال کے لیے خود کو تیار کر کے آئی تھی مگر اس وقت معلوم نہیں کیوں اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ اس سے جھوٹ نہیں بول پائے گی۔ وہ اپنی ذہین آنکھوں سے نہ صرف یہ کہ اس کا جھوٹ پکڑ لے گا بلکہ شاید ساری سچائی بھی جان جائے۔ اس نے لاشعوری طور پر ماتھے پر آیا

فرحت اشتیاق

پسینہ صاف کیا تھا۔
"اس لیے کہ آپ کے ایڈ میں دیا ہوا سیلری پیکیج اور دیگر مراعات میرے لیے attractive (پرکشش) تھیں۔ میں ہاؤس جاب کے بعد سے پچھلے ایک سال کے دوران گورنمنٹ جاب حاصل کرنے کے لیے خاصی کوششیں کر چکی، جن میں سوائے ناکامی کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اگر پرائیویٹ جاب ہی کرنی ہے تو ایسی جگہ کیوں نہ کروں جہاں مجھے میری محنت کا بہتر معاوضہ مل رہا ہو۔"
گھر سے سوچ کر آئے ہوئے انسان دوستی، خدمت خلق، وطن کی خدمت اور دکھی انسانیت کا درد قسم کے الفاظ اسے یکسر بھول گئے تھے۔ جھوٹ تو خیر اس نے ابھی بھی بولا تھا مگر گھر سے سوچ کر آئی ہوئی دھواں دھار تقریر وہ بہرحال نہیں کر پائی تھی۔ اس کے چہرے پر اپنی بات کا ردعمل دیکھنا چاہا تو سوائے سپاٹ چہرے کے کچھ نظر نہ آیا۔ یہ یقیناً "انٹرویو کا آخری سوال تھا کیونکہ اس سوال کا جواب دیتے ہی اسے جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ بلاشبہ یہ اس کی زندگی کا سب سے طویل انٹرویو تھا۔
دائیں طرف بیٹھی خاتون ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کر بقیہ دونوں حضرات کو خدا حافظ کہتی بیگ کندھے پر ڈال کر وہ کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔
انٹرویو کے دوران خاتون نے بھی اور دوسرے ڈاکٹر صاحب نے بھی بات چیت کے ساتھ ساتھ فائل میں لگی اس کی اسناد کا بغور جائزہ لیا تھا۔ مگر وہ عجیب آدمی تھا اس نے نہ تو فائل کو ہاتھ لگایا تھا اور نہ ہی کوئی پیشہ ورانہ سوال کیا تھا۔ حالانکہ وہ دونوں مسلسل اس سے مختلف پیشہ ورانہ امور پر سوال جواب کرتے رہے تھے۔
"کتنا عجیب سا تھا وہ بندہ۔ بظاہر یوں لگ رہا تھا جیسے کہیں کھویا ہوا ہے۔ لیکن ایسا تھا نہیں۔" گھر آنے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک وہیں کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ "وہ پوری طرح وہاں موجود تھا اور میرے ہر ہر انداز اور ہر ہر جملے کو تول رہا تھا۔ اندازہ لگا رہا تھا کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔ مجھے اپنے پیشے سے متعلق کتنی معلومات ہیں۔ اسے کاغذوں میں لکھی ڈویژن اور گریڈز میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ میرے اندر موجود ہر اچھائی، ہر برائی، ہر خوبی اور ہر خامی کو خود کھوج رہا تھا۔"

"کیسا رہا تمہارا انٹرویو؟" خالہ امی نے اس کی شکل دیکھتے ہی سب سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔
"آپ دعا کریں۔ وہاں موجود ایک صاحب سے میں نے پوچھا تھا، وہ بتا رہے تھے کہ میرے علاوہ بھی تین لیڈی ڈاکٹرز انٹرویو دے کر جا چکی ہیں اور آج بھی میرے آنے کے بعد شاید دو اور ڈاکٹرز کو انٹرویو دینے کے لیے آنا ہے۔" وہ تھکے ہارے انداز میں بستر پر گر گئی تھی۔
"خواہ مخواہ دردِ سری مول لے رہی ہو تم، اچھی بھلی تو چل رہی ہے یہاں تمہاری جاب، چلو بھئی، مانا کہ بہت عالیشان نہیں ہے لیکن نہ سے ہاں تو ہے۔ پھر اللہ نے چاہا تو ہمیں پر اچھی جاب بھی مل جائے گی۔"
اسے اس سے خالہ امی پر بہت ترس آیا تھا۔ حالانکہ دل سے وہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ اسے وہاں جاب مل جائے مگر بے چاری مجبور تھیں کہ اسے زبردستی روکیں، وہاں جانے کی مخالفت کریں۔
تقریباً "پندرہ دن پہلے اس کی نظر اخبار میں دیے گئے اس اشتہار پر پڑی تھی۔ ان دنوں وہ اسی ادھیڑبن میں مصروف تھی کہ ایسا کیا کرے کہ یہاں سے چلی بھی جائے اور خالہ امی کا بھرم بھی رہ جائے۔ ایک سال پہلے جب وہ خالہ امی کے پاس کراچی سے پشاور آئی تھی تو اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ وہاں کی گھٹن اور اجنبی رویوں سے نکل کر یہاں کے اپنائیت بھرے ماحول میں آکر اسے حد درجہ طمانیت نصیب ہوئی تھی۔ خالو کا کوئی سال ہوئے انتقال ہو چکا تھا۔
خالہ امی کا گھرانہ ایک مڈل کلاس گھرانہ تھا۔ دو بڑی بیٹیوں کی وہ شادی کر چکی تھیں اور اب گھر میں محسن بھائی اور شملہ بچے تھے۔ اس نے اس گھر کو اپنا گھر سمجھ لیا تھا۔ محسن بھائی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ، شملہ کے ساتھ چھوٹی چھوٹی شرارتیں، وہ پچھلی ہر بات بھول چکی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے ایک پرائیویٹ کلینک میں جاب بھی مل گئی تھی۔ خالہ امی کی محبت اپنی جگہ لیکن وہ ان لوگوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ محسن بھائی کی آمدنی اتنی زیادہ نہیں کہ وہ ان پر اپنا بار بھی ڈال دے۔ خالہ امی شملہ کی شادی اور پھر محسن بھائی کی عنقریب ہو جانے والی شادی کے لیے جوڑ توڑ میں مصروف رہتی تھیں۔ ایسے میں اسے اپنی وجہ سے ان لوگوں پر کوئی

بوجھ ڈالنا ہرگز منظور نہیں تھا۔ جاب مل جانے پر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔
زندگی بہت پرسکون گزر رہی تھی جب تک محسن بھائی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ان کی شادی ہوتے ہی زندگی کا سارا سکھ چین جاتا رہا تھا۔ روبی بھابی کو شروع دن سے اس سے پتا نہیں کس وجہ سے دشمنی ہو گئی تھی۔ شروع شروع میں تو وہ ان کے رویے کو سمجھ ہی نہیں پائی تھی۔ مگر جب آگے پیچھے کئی مرتبہ انہوں نے کسی اور پر رکھ کر اس پر طنزیہ جملے کسے تو وہ حیران رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں اس سے کس بات کی پرخاش ہے۔ اپنی طرف سے اس نے ان کے ساتھ خوشگوار اور دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی بہت کوششیں کیں مگر اس کی کوئی بھی کوشش بار آور ثابت نہ ہو سکی تھی۔ شروع شروع کے طنزیہ جملے بعد میں براہ راست کاٹ دار گفتگو میں تبدیل ہو گئے تھے۔
یہاں تک تو اس نے برداشت کیا تھا۔ وہ ان کی باتوں پر خاموشی اختیار کر کے جھگڑے کو پنپنے نہیں دیتی تھی یہی سوچ کر کہ وہ اکیلی کب تک لڑیں گی۔ آخر کار خود ہی ہمت ہار جائیں گی مگر اس کی یہ خام خیالی جلدی غلط ثابت ہو گئی تھی۔ پہلے محسن بھائی اور پھر بعد میں شملہ کو بھی انہوں نے اس انداز سے اس سے برگشتہ کیا کہ وہ دیکھتی رہ گئی۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے محسن بھائی سوائے سلام کا جواب دینے کے اس سے کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ کتنا ہتک آمیز لگتا تھا اسے ان کا رویہ۔ اسے نظر انداز کیے وہ خالہ امی اور شملہ سے بالکل پہلے والے اسٹائل میں باتیں کرتے اور اسے یوں نظر انداز کر دیتے جیسے وہ وہاں موجود ہی نہیں ہے۔
ابھی وہ محسن بھائی کے سلوک پر ہی افسردہ ہو رہی تھی کہ شملہ کو بھی انہوں نے اس سے بدگمان کر دیا۔ اس روز وہ کلینک سے خلافِ معمول گھر جلدی واپس آ گئی تھی۔ لاؤنج میں بیٹھی باتیں کرتی ہوئی بھابی اور شملہ نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے اپنا نام سن کر وہ ٹھٹک کر رک گئی تھی۔
"اس لڑکی کے ہوتے ہوئے تمہاری شادی کبھی بھی نہیں ہو سکتی۔ سوچو ذرا" آخر ایسی کیا بات ہے کہ ایک بار آنے کے بعد کوئی دوبارہ پلٹتا ہی نہیں۔ امی بھی اس وجہ سے سخت پریشان ہیں اور ابھی پرسوں جو رشتہ محسن کے دوست کے گھر سے آیا تھا، پتا ہے ان لوگوں نے کیا کہا ہے۔"
وہ شملہ کے پاس بیٹھی ہمدردانہ انداز میں کہہ رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے ان کی بات سن رہی تھی۔
"ان کی والدہ نے کہا ہے کہ آتے وقت جس لڑکی کو ہم نے گیٹ پر دیکھا تھا، اگر اس سے رشتے کی بات چلے تو انہیں بہت خوشی ہوگی۔ حالانکہ تم کوئی بدشکل تو نہیں اور نہ ہی وہ کوئی حسینہ عالم۔ مگر ایسی لڑکیوں کو مردوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے تمام گر آتے ہیں۔ کچھ ایسے ناز و ادا دکھائے ہوں گے، جو' موصوف صرف گیٹ پر ایک جھلک دیکھ کر ہی عاشق ہو گئے۔"
وہ سن ہی کھڑی رہ گئی تھی۔ کانوں میں صرف وہی الفاظ بار بار گونج رہے تھے۔ "ایسی لڑکیاں" "اس کا دل چاہا، وہ جا کر ان کا گریبان پکڑ کر پوچھے "کیسی لڑکیاں؟" وہ کس قسم کی لڑکیوں کا ذکر کر رہی تھیں۔
اس رات کتنے عرصے بعد وہ پھر سے اپنے رب سے شکوہ کناں ہوئی تھی۔
"کب میری سزا معاف ہوگی؟ آخر کب؟ تو بہت غفور و رحیم ہے۔ اگر بندہ سچے دل سے توبہ کرے تو تو اپنے بندوں کے بڑے سے بڑے گناہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ اور میں تو اتنے برسوں سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی ہوں تو تجھے مجھ پر رحم کیوں نہیں آتا۔ کیا میرا ماضی کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ کیا کتاب زندگی کے وہ اوراق جو میری زندگی کا شرمناک باب ہیں، ہوا برد نہیں ہو سکتے۔ آخر یہ ذلت اور کتنی سہنی ہے۔ اور کتنی میرے اللہ؟"
اپنے تمام آنسو اپنے اندر اتار کر وہ تمام تر معمولات زندگی میں حصہ لے رہی تھی۔ مگر وہ جو دل نے اس گھر کو اپنا گھر ماننا شروع کر دیا تھا۔ وہ والی تمام کیفیات ختم ہو گئی تھیں۔ شملہ برائے نام صرف انتہائی ضرورت کے وقت اس سے بات کیا کرتی تھی۔ خالہ امی کا رویہ البتہ پہلے جیسا ہی تھا۔ وہ لوگوں سے میل جول کے معاملے میں اچھی خاصی روکھی پھیکی مشہور تھی۔ صرف رشتے کے حوالے سے ہی کیا، ویسے بھی وہاں کوئی مہمان آتا تو وہ شاذ و نادر ہی کبھی ڈرائنگ روم کی طرف جھانکتی ہوگی۔ ایسے میں اس پر الزام کہ وہ شملہ کے لیے آنے والے رشتوں کو اپنے لیے۔ اسے ایسی بات سوچتے ہوئے بھی شرم آرہی تھی۔ کتنا

گھٹیا الزام لگایا تھا بھابھی نے اس پر۔ اس کا کئی بار دل چاہا کہ وہ شہلا کو سمجھائے کہ "پیاری شہلا! تم اداس اور نا امید مت ہو۔ جب تمہارے نصیب کھلیں گے تو ہر رکاوٹ آپ ہی آپ دور ہو جائے گی اور ضروری تو نہیں کہ آنے والے تمہیں ناپسند کر دیتے ہوں، ہو سکتا ہے کہ ابھی وہ درست وقت ہی نہیں آیا ہو جو اللہ نے تمہاری شادی کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔"

مگر وہ ایک دم اٹھی اور چلی گئی تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے بات نہیں کر پائی تھی۔

اس روز وہ کلینک سے واپس آ رہی تھی۔ جب رشتے کے لیے آنے والوں سے اس کی گیٹ پر مڈبھیڑ ہوئی تھی اور سوائے ایک رسمی سے سلام کے وہ تو وہاں بالکل بھی نہیں رکی تھی۔ مگر بھابی نے جو بدگمانی اور شک کا بیج بویا تھا، وہ آہستہ آہستہ پھلنا پھولنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ چپ چاپ سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر کسی انتہائی فیصلے کے بارے میں اس نے اس وقت تک کچھ نہیں سوچا تھا جب تک کہ بھابی نے اس پر محسن بھائی کے حوالے سے انتہائی گھٹیا الزام نہیں لگایا تھا۔ اس روز صرف اتنا ہی تو ہوا تھا کہ طوفانی بارش میں اسے اپنا گھر واپس پہنچنا مشکل لگ رہا تھا اور اس نے محسن بھائی کو آفس فون کر کے کہہ دیا تھا کہ واپسی میں اسے بھی پک کر لیں۔ اسے اور محسن بھائی کو ایک ساتھ آتا دیکھ کر بھابی نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ ان کے کمرے سے چیخنے چلانے کی آوازیں اتنی صاف سنائی دے رہی تھیں کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی با آسانی سب کچھ سن رہی تھی۔

"شرم آنی چاہیے تمہیں اتنے واہیات الزام لگاتے ہوئے۔" محسن بھائی چلائے تو وہ جواباً ان سے بھی تیز آواز میں چلائیں۔

"شرم آپ کو آنی چاہیے جو گھر میں پاکباز اور حیادار بیوی کے ہوتے ہوئے ایسی بدچلن لڑکیوں کے ساتھ گلچھرے اڑاتے ہیں۔" وہ ساری رات اس ذلت پر بے آواز روتی رہی تھی۔ اسے کیا کرنا تھا، وہ بالکل بھی نہیں جانتی تھی مگر یہ تو طے تھا کہ اب اسے یہاں نہیں رہنا تھا۔ اگلے روز خالہ امی اسے خود سے نظریں چراتی ہوئی مزید شرمندہ کر گئی تھیں، وہ سارا دن سوچتی رہی تھی کبھی سوچتی کسی ورکنگ وومن ہاسٹل میں رہنا شروع کر دے۔ کبھی سوچتی، انہیں پے انگ گیسٹ کے طور پر رہنے لگے مگر کوئی بھی بات اس کے دل کو نہیں لگ رہی تھی۔ اسی شہر میں رہتے ہوئے ہاسٹل وغیرہ میں رہنا بڑا نا ممکن کام تھا۔ خالہ امی کو اپنے ملنے ملانے والوں کے سامنے کتنی شرمندگی ہوتی جن سے وہ برملا کہا کرتی تھیں۔

"زوبیہ تو اب میرے ہی گھر سے رخصت ہو گی۔ ماہ طلعت کی بیٹی ہے یہ اور اس کے احسانات تو میں مرتے دم تک نہیں اتار سکتی۔" اور اب اسی پیاری ماہ طلعت کی لاڈلی بیٹی ہاسٹل میں رہتی تو لوگ دس طرح کی باتیں نہ بناتے۔ وہ جتنا سوچ رہی تھی، دماغ اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔

مگر اسی روز رات میں اخبار دیکھتے ہوئے جب اس کی اس اشتہار پر نظر پڑی تو ایسا لگا جیسے اس کے مسئلے کا حل نکل آیا ہو۔ اس نے اگلے ہی روز اپنی "سی وی" پوسٹ کر دی تھی اور بے تابی سے جواب کا انتظار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے وہاں سے کال آنے کی کافی امید تھی۔ اتنی دور افتادہ اور ترقی پذیر بستی میں کسی ڈاکٹر اور وہ بھی لیڈی ڈاکٹر کا جانا خاصا مشکل کام تھا۔ اشتہار میں دی گئی ترغیبات بھی غالباً لیڈی ڈاکٹرز کو کشش دینے کے لیے ہی تھیں۔

وہاں سے انٹرویو کی کال آئی، تب اس نے خالہ امی کو اس بابت سب کچھ بتایا تھا۔ انہوں نے اوپری دل سے ڈانٹا ڈپٹا تھا مگر صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس کے چلے جانے کا سن کر خوش ہو گئی ہیں۔ شاید آج کل میں وہ خود بھی اس سے یہی سب کہنے والی تھیں مگر کہنے کا منہ نہیں پڑ رہا تھا۔ کیسے کہہ دیتیں اسے کہ واپس اپنے گھر لوٹ جاؤ۔ وہ جس کی ماں نے ان پر بے شمار احسان کر رکھے تھے اسے اپنے گھر سے کیونکر نکلنے کا حکم سنا دیتیں۔

اسے خالہ امی پر بہت ترس آتا تھا، ایک طرف وہ اولاد کے ہاتھوں مجبور تھیں تو دوسری طرف احسانوں کا پاس۔ گھر کا ماحول ویسا ہی کشیدہ چل رہا تھا۔ نہ بھابی نہ شہلا اور نہ ہی محسن بھائی کوئی بھی اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ وہ وہاں مجرموں کی طرح رہ رہی تھی۔ کئی بار اسے خیال آتا کہ اگر وہاں سے کال نہیں آئی تو کیا ہو گا۔

♥ ♡ ♡ ♥
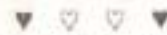
انٹرویو دے کر آنے کے پانچویں روز اس نے ڈاکٹر آصف علی کی فون کال ریسیو کی تھی۔ "آپ پہلی تاریخ سے جوائن کر سکتی ہیں۔" انہوں نے مژدہ جاں فزا سنایا تھا۔ وہ

آواز سے پہچان گئی تھی۔ ڈاکٹر آصف علی انٹرویو کے وقت وہاں موجود تھیں۔ جلدی جلدی سب تیاری کر کے وہ جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ ایک اور دربدری، ایک اور جلاوطنی کے لیے۔

"ویک اینڈز پر ضرور آیا کرنا۔" اسے ایئرپورٹ چھوڑنے کے لیے محسن بھائی آئے تھے۔ اس کے اس طرح جانے کا سن کر وہ خاصے شرمندہ نظر آ رہے تھے اور ان کا شرمندہ سا لہجہ اور نظریں چرانے والا انداز اسے خود بھی شرمسار کر رہا تھا۔ جواباً گردن اقرار میں اس طرح ہلائی تھی۔ جیسے ہر ویک اینڈ اور تمام تر تعطیلات یہاں گزارنے کے لیے دل و جان سے تیار تھی۔ رخصت ہوتے وقت جب اس نے بھابی کو سلام کیا تو وہ بنا جواب دیے اپنے کمرے میں گھس گئی تھیں۔ شہلا البتہ خالہ امی کے ساتھ اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔ وہی رسمی تاکیدیں ہوئی تھیں کہ چھٹیوں میں ضرور آیا کرنا اور اس نے بھی رسماً "ہاں" بھر لی تھی۔

جہاز میں ارد گرد سے لاتعلق بیٹھے اسے پتا نہیں کیوں برسوں پہلے پڑھی نظم یاد آئے چلی جا رہی تھی۔

کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یار نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا

وہ تمام تر سوچوں کو جھٹک کر ذہن کو پرسکون رکھنا چاہ رہی تھی۔ ہر فکر سے ذہن کو آزاد کر کے اس قدرتی حسن سے مالامال سرزمین میں کھو گئی۔

گاڑی اس پرشکوہ عمارت کے سامنے رکی تو وہ باقی ہر سوچ اور ہر چیز سے دھیان ہٹا کر اس قدیم و جدید آرکیٹکچر کا امتزاج لیے ہوئے حسین عمارت کو بغور دیکھنے لگی۔ اس کا انٹرویو پشاور میں ہی ہوا تھا اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ان لوگوں نے انٹرویو کے لیے پشاور کے ایک بڑے ہاسپٹل کا انتخاب کیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے ہاسپٹل کا جو خاکہ اپنے ذہن میں بنایا تھا، وہ اس سے کئی گنا حسین و دلکش تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ڈاکٹر آصف علی نے گرم جوشی سے گلے لگا کر اس کا استقبال کیا تھا۔

"ویلکم ڈاکٹر زوبیہ۔" وہ پچپن اور ساٹھ کے درمیان ہوں گی۔ کالے رنگ کا سواتی کڑھائی کا سوٹ اور اوور آل کے اوپر بڑی سی کالے رنگ کی ہی گرم شال اور ہلکی پھلکی نازک سی جیولری میں وہ بہت گریس فل اور پیاری لگ رہی تھیں۔ چہرے کی سرخ و سفید رنگت پر سرخ رنگ کی لپ اسٹک بہت سوٹ کر رہی تھی۔ انٹرویو والے دن کے سرد و سپاٹ تاثرات کی جگہ آج خوشگوار مسکراہٹ نے لی ہوئی تھی۔

"سفر میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔؟"

"ڈرائیور صحیح وقت پر پہنچا کہ نہیں۔"

وہ اپنائیت بھرے انداز میں اسے ساتھ لے کر چلتی ہوئی مسلسل سوال جواب میں مصروف تھیں۔ ان کی باتوں کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ وہ گردوپیش کا بھی بغور جائزہ لے رہی تھی۔ وہاں کا شاندار انٹیریئر دیکھ کر اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسی ترقی پذیر علاقے میں موجود ہے۔

اس سے باتیں کرتی ہوئی ڈاکٹر آصف ایک کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر شہنور علی نے کرسی پر سے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا تھا۔

"کیسے سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟" ان کے لہجے میں بزرگانہ شفقت موجود تھی۔ وہ ان لوگوں کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ ڈرائیور سے لے کر اب ڈاکٹر شہنور علی تک سب کا رویہ اتنا پر خلوص اور مہمان نوازی سے بھرپور تھا جیسے وہ یہاں ملازمت کرنے نہیں بلکہ شاید کسی دعوت پر آئی ہے۔ اس سے گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آصف کو بھی کسی نہ کسی بات پر چھیڑ رہے تھے۔

"یہ خاتون اصل میں میری بیگم بھی ہیں۔" وہ اس کی حیرت بھانپتے ہوئے مسکرا کر بولے تو وہ بھی مسکرا دی۔

"اسفندیار کو ہیلتھ منسٹری میں کچھ کام تھا، اسی لیے وہ اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ شاید کل تک واپس آ جائے۔ اب آپ کو تو پتا ہی ہے معاملہ چاہے کسی ہسپتال کا ہو، یا پرائیویٹ کالج، یونیورسٹی یا کسی اور ادارے کا جب تک اسلام آباد میں تعلقات صحیح نہ رکھے جائیں۔ کسی بھی ادارے کا چلنا تقریباً ناممکن ہی ہے۔" کافی کا سپ لیتے

ہوئے انہوں نے کہا پھر کچھ خیال آنے پر بولے۔ "ڈاکٹر اسفندیار خان کو تو جانتی ہیں نا آپ؟ وہ اس دن انٹرویو کے وقت موجود تھے۔"

اس کے ذکر کے ساتھ ہی اسے اس بندے کا پراسرار سا انداز بھی یاد آ گیا تھا۔

"اسفندیار ہی اس ہسپتال کا مالک ہے۔ چھ سال پہلے اسفندیار، میں اور شہنور ہم تینوں نے اس ہسپتال کی بنیاد رکھی تھی۔ شروع میں ہمارے پاس سہولیات بھی کم تھیں، ڈاکٹرز اور دیگر اسٹاف بھی نہ ہونے کے برابر تھا، ہم لوگ محنت تو کر رہے تھے مگر اتنے پر امید نہیں تھے کہ ہمیں ہمارے مقصد میں کامیابی حاصل بھی ہو جائے گی۔ مگر اسفند، وہ انتھک محنت پر یقین رکھتا ہے، بہت مشکل پسند ہے وہ۔ ہم لوگ تھکنے لگتے ہمت ہارنے لگتے مگر وہ اپنے ارادوں میں اٹل تھا اور یوں دیکھ لو صرف اتنے سے سالوں میں ہمارا ہسپتال اللہ کے فضل سے کتنی ترقی کر چکا ہے۔ ایکسرے، الٹرا ساؤنڈ، دیگر بے شمار ٹیسٹ وغیرہ اب ہم اپنے ہاں ہی کر لیتے ہیں، ہمارا آپریشن تھیٹر بھی تین سال ہوئے شروع ہو چکا ہے۔ پہلے مریضوں کو معمولی سا بلڈ ٹیسٹ کروانے بھی شہر جانا پڑتا تھا اب اللہ کا شکر ہے، ہمارے پاس تمام سہولتیں موجود ہیں۔" ڈاکٹر آصفہ کے چہرے پر فخر اور خوشی کے رنگ نظر آ رہے تھے۔

"آپ لوگ یہیں کے رہنے والے ہیں؟" ان دونوں کی سرخ و سفید رنگت اور لہجے سے اس نے یہی اندازہ لگایا تو پوچھ بیٹھی۔ انگلش وہ دونوں ہی بالکل درست تلفظ میں بول رہے تھے مگر اردو صاف نہیں تھی۔

"ہاں، میری پیدائش یہیں کی ہے۔ آصفہ البتہ ایبٹ آباد کی رہنے والی ہے۔ میرے بچپن میں ہی ہماری ساری فیملی امریکہ سیٹل ہو گئی تھی۔ تعلیم مکمل ہوئی، پھر وہیں آصفہ سے ملاقات ہوئی اور ہم دونوں کی شادی بھی ہو گئی۔ یہاں کوئی تھا ہی نہیں جس کے لیے واپس آتے ساری زندگی امریکہ میں بتا دی۔ شادی کے بعد بھی پڑھتے رہے۔ خوب ڈگریاں لیں، خوب علم حاصل کیا۔ بہت ساری دولت کمائی ہم دونوں مطمئن تھے کبھی بھولے سے بھی وطن کو یاد نہیں کیا۔ تاوقتیکہ اسفندیار سے ملاقات نہیں ہو گئی۔ میں فلوریڈا یونیورسٹی میں پروفیسر تھا اور اسفند میرا اسٹوڈنٹ وہ بہت اچھا اور بہت ہی جینئس اسٹوڈنٹ تھا اور ساتھ ہی ساتھ میرا ہم وطن بھی، اسی حوالے سے ہماری اسی وقت بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ اس نے وہاں سے پوسٹ گریجویشن کیا وہ بھی اعزازی نمبروں کے ساتھ۔ وہ جتنا قابل اور اچھا سرجن تھا اسی حساب سے اسے بہت سی اچھی جگہوں سے جابز آفر ہوئیں مگر اس نے کسی آفر کو قبول نہ کیا۔ اس وقت مجھے لگا تھا کہ اسفند پاگل ہے، اسے اپنے فیوچر، اپنے کیریئر، کسی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے سمجھانے پر وہ دوٹوک انداز میں بولا تھا۔

"میں یہاں غیروں کو زندگی کی نوید سناؤں، جبکہ ان کے پاس بہترین معالجوں کی کوئی کمی نہیں اور وہاں میرے چھوٹے سے گاؤں میں لوگ وقت پر علاج نہ ہونے کے سبب سسک سسک کر دم توڑ دیں۔ سوری سر! ایسی دنیا مجھے نہیں کمانی۔ یہاں کیریئر ہو گا، نام ہو گا، بہت سا پیسہ ہو گا مگر وہ جو میرے اندر ایک شخص رہتا ہے، وہ مجھے ایسا کرنے کی کبھی بھی اجازت نہیں دے سکتا۔"

تب میں پہلی بار چونکا تھا۔ کتنا مختلف تھا وہ کم عمر سا لڑکا۔ اس روز پہلی مرتبہ مجھے پچھتاوؤں نے گھیرا تھا۔ وہ ینگ تھا، وہاں کی بھاگتی دوڑتی زندگی اور چکا چوند میں اس کے لیے کتنی ساری کشش ہو گی مگر وہ سب کچھ ٹھکرا کر واپس آ گیا تھا اور میں ساری زندگی اپنے وطن سے دور، غیروں کی دلجوئی میں لگا رہا۔"

وہ بہت سنجیدگی سے بول رہے تھے۔ اسفندیار کا ذکر کرتے ہوئے ان کے لہجے میں بہت فخر اور پدرانہ شفقت محسوس کی تھی اس نے۔ وہ اسے بتا رہے تھے کہ

جب اسفندیار تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان واپس آ رہا تھا تو اسی وقت وہ لوگ اپنی اس چھوٹی سی بستی میں ایک ہسپتال قائم کرنے کا مصمم ارادہ کر چکے تھے۔ ہسپتال بنانے کا خواب اسفند نے دیکھا تھا اور ان دونوں میاں بیوی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس خواب کو تعبیر دینے میں اس کا پورا پورا ساتھ دیں گے۔ چھ سال پہلے اسفندیار نے انہیں ہسپتال کی عمارت تیار ہو جانے کی نوید سناتے ہوئے یہاں آنے کی دعوت دی تھی اور ان لوگوں نے فوراً "رخت سفر" باندھا تھا۔ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی وہ کر چکے تھے اور اب ہر طرح کی ذمہ داریوں سے فارغ تھے۔ وہاں کی پر تعیش زندگی اور بہترین ملازمت چھوڑ کر انہوں

نے بقیہ تمام عمر یہیں بتانے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنے اس فیصلے پر وہ دونوں بہت مطمئن تھے۔

لمبے چوڑے مضبوط جسامت والے ڈاکٹر شہنوز علی اسے بہت اچھے لگے تھے۔ ان کے چہرے پر داڑھی اور نماز کے نشان نے ان کی پر وقار شخصیت میں ایک بڑا پیارا نورانی سا تاثر پیدا کیا ہوا تھا۔

"آیئے' میں آپ کا ہمارے اسٹاف سے تعارف کروا دوں۔"

کافی پی کر فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر آصفہ نے اسے ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی۔ اسٹاف اچھے خاصے افراد پر مشتمل تھا۔ ٹیکنیشنز' وارڈ بوائز' نرسیں وہ اسے فردا" فردا" سب سے متعارف کروا رہی تھیں۔ وہاں خواتین اسٹاف بہت کم تھا۔ اس کے استفسار پر ڈاکٹر آصفہ نے بتایا تھا۔

"یہاں عورتوں کا کام کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے اور اتنی دور دراز کہیں اور سے آکر خواتین کا کام کرنا بھی بہت ہی مشکل کام ہے۔ ہمارے پاس خاتون ڈاکٹر میرے علاوہ کوئی تھی ہی نہیں۔ پیرا میڈیکل اسٹاف میں بھی خواتین بہت کم ہیں اور پردے کی اتنی زیادہ سختی ہے کہ عورتیں مرد ڈاکٹر سے علاج ہی نہیں کرانا چاہتیں۔

آپ کو اپائنٹ کرنے کی ضرورت بھی اسی لیے پیش آئی تھی کہ' میں اکیلی لیڈی ڈاکٹر تھی۔ دن رات کوئی وقت میرے پاس آرام کے لیے بچتا ہی نہیں تھا۔ اسفند نے کہا کہ ہم ایک لیڈی ڈاکٹر اپائنٹ کر لیتے ہیں تاکہ آپ کا بوجھ کم ہو سکے۔"

وہاں دو ڈاکٹرز اور بھی تھے جن میں سے وہ صرف ایک سے ہی مل پائی تھی۔ ڈاکٹر شہاب رفیق سوات کے ہی رہنے والے تھے' فیملی ان کی منگورہ میں رہتی تھی۔ دوسرے ڈاکٹر تاجدار خان جن سے اس کی ابھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سب نے اسے کھلے دل سے خوش آمدید کہا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

صبح وہ اذان کے ساتھ ہی بیدار ہو گئی تھی۔ نماز پڑھ کر وہ بہت دیر تک دعا مانگتی رہی تھی' آج اس کی جاب کا پہلا دن تھا اور وہ اپنے رب سے اس میں بہتری کی دعا کر رہی تھی۔ ناشتہ کر کے تیار ہونے کے بعد وہ ہاسپٹل آگئی تھی۔ سر پر دوپٹہ' اسکارف یا چادر وہ کچھ نہ کچھ ضرور لیتی تھی۔

اسی لیے اسے یہاں کا پردہ دار ماحول دیکھ کر گھٹن کا احساس نہیں ہوا تھا۔ کوریڈور میں اس کی ڈاکٹر شہنور سے ملاقات ہو گئی تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟ ہاسپٹل میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟ اپنا کمرہ پسند آیا؟ اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی باتیں پوچھ ڈالی تھیں۔

"نہیں' مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ضرورت کی تمام چیزیں وہاں موجود ہیں۔" اس نے شائستگی سے دھیمے لہجے میں جواب دیا تھا۔

انہوں نے مزید کچھ اور کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا جب سامنے سے آتے اسفند یار کو دیکھ کر چپ ہو گئے تھے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ کھڑی اس کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

"السلام علیکم!" ڈاکٹر شہنور کو سلام کرتے ہوئے اس نے ان سے ہاتھ بھی ملایا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ شاید اسے پہچانا ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس نے سرسری نظروں سے بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے خود ہی اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ وہ ڈاکٹر شہنور سے باتوں میں مصروف تھا سلام کی آواز سن کر وہ چونکا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" بڑا مختصر سا جواب دیا گیا تھا اور صرف ایک لحظہ کو اس کی سمت نظریں کی تھیں اور دوبارہ گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑ دیا تھا۔

وہ دونوں باتوں میں مصروف تھے' اس کے چلے جانے کو تو شاید وہاں محسوس بھی نہیں کیا گیا ہو گا۔ وہ انہیں اسلام آباد کے دورے کی تفصیل دے رہا تھا اور وہ بھی پوری طرح اس گفتگو میں کھوئے ہوئے تھے۔ "باقی سب بہت اچھے' ملنسار' اخلاق والے' مہمان نواز' مگر جس کی میں ملازم ہوں' وہ انتہائی بد اخلاق۔ گزارہ کافی مشکل ہو گا۔" ڈاکٹر آصفہ کے آجانے تک وہ یہی سوچتی رہی تھی۔

ڈاکٹر آصفہ آگئیں تو سلام دعا کے بعد فورا" ہی انہوں نے اسے یہاں کے مریضوں کی نفسیات" اور ان کو مطمئن کرنے کے طریقے سمجھانے شروع کر دیے۔

"آپ کو اسفند بلا رہے ہیں۔" ریسیور واپس رکھتے ہوئے انہوں نے اس سے کہا تھا۔

"تشریف رکھیے۔" وہ کسی سے فون پر مصروف گفتگو تھا۔ اسے بیٹھنے کے لیے کہنے کے بعد وہ دوبارہ فون کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ خاموشی سے میز پر نظریں جمائے اس کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ دو تین منٹ بعد اس نے فون بند کیا تو اس نے میز پر سے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"ڈاکٹر آصفہ نے آپ کا سب سے تعارف کروا دیا؟" براہ راست اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا گیا تھا۔

"جی۔" اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

"کام کی نوعیت اور پیشنٹس کے بارے میں تمام ضروری باتیں بھی آپ کو وہی بتائیں گی۔ ظاہر ہے ابھی آپ کے کیریر کی شروعات ہے' آپ کو کسی ہاسپٹل میں کام کرنے کا ایکسپیرینس نہیں' ڈاکٹر شہنور' ڈاکٹر آصفہ اور خود میرے پاس آپ جس وقت چاہے آکر اپنی کوئی بھی پرابلم ڈسکس کر سکتی ہیں۔ کام کے حوالے سے بھی اور اس کے علاوہ بھی آپ کو جو کوئی پریشانی ہو' آپ ہم تینوں میں سے کسی سے بھی بلا جھجک بات کر سکتی ہیں۔" وہ سنجیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا تھا۔ ان تمام باتوں میں جواب طلب کوئی بات تھی ہی نہیں اس لیے اس نے صرف گردن ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

"انٹرویو کے دن مجھے آپ کی صاف گوئی اچھی لگی تھی مگر اب میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے پروفیشن کو سیلری پیکیج سے ذرا ساہٹ کر بھی دیکھنا شروع کریں۔ اگر ہم دوسروں کی تکلیف اور ان کے درد کو اپنے دل میں محسوس کرنا شروع کر دیں تو سمجھ لیں کہ ہم نے اپنے پیشے کا حق ادا کر دیا۔"

وہ اس کے جملوں پر تھوڑی سی شرمندہ ہو گئی تھی۔ شاید وہ اسے بہت لالچی اور دولت پرست لڑکی سمجھا تھا۔

"میں پروفیشنلزم پر یقین رکھتا ہوں۔ اگر ہم پروفیشنلز ہیں تو ہمارے ہر انداز اور ہر بات میں پروفیشنلزم کی جھلک نظر آنی چاہیے۔ ہاسپٹل کا ماحول ایک ہاسپٹل جیسا ہی رکھنے کے لیے میں نے یہاں کچھ اصول و ضوابط مقرر کیے ہیں۔ جن پر میں خود بھی سختی سے عمل کرتا ہوں اور اپنے سارے اسٹاف سے بھی اس کی توقع کرتا ہوں اور وہ اصول کیا ہیں؟ بہت ہی سادہ اور آسان مثلا" وقت کی پابندی' کام پوری ذمہ داری اور لگن سے کرنا۔"

لہجہ بہت دو ٹوک اور پیشہ ورانہ قسم کا تھا۔

"آپ کو کوئی بات پوچھنی ہو تو پوچھیں۔"

شاید ہدایت نامہ مکمل ہو چکا تھا۔ اس کے نفی میں سر ہلانے پر وہ گویا ہوا۔

"میں آپ کو یہاں خوش آمدید کہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ یہاں ایک اچھا اضافہ ثابت ہوں گی۔"

بہت سنجیدہ اور پروفیشنل قسم کا انداز تھا۔ دیکھنے کا اسٹائل ایسا تھا کہ میں گفتگو تمام کر چکا۔ اب آپ جا سکتی ہیں۔ کرسی پر سے اٹھتے ہوئے اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ کیا اسے کوئی رسمی قسم کا بیان دینا چاہیے کہ "جی آپ مجھے بہت مخلص اور ذمہ دار پائیں گے۔ میں آپ کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ آنے والا وقت ثابت کرے گا کہ میرا انتخاب بالکل درست تھا۔" مگر وہ یہ سب صرف سوچ کر ہی رہ گئی۔ ایسی باتیں اس سے کہی ہی نہیں جاتی تھیں۔ ایک تو وہ فطرتا" کم گو تھی مزید یہ کہ ایسے چاپلوسانہ جملے وہ کبھی بھی نہیں بول سکتی تھی۔ سو خاموشی سے اٹھ کر باہر آگئی تھی۔

آنے والے دو چار دنوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر اسفند یار نے جو کچھ اس سے کہا تھا۔ وہ یہاں سب لوگوں کو ازبر تھا۔ سب ڈاکٹر اسفند یار خان کے نام سے ڈرتے تھے اس کا خوف ایسا سوار تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں بھی ان اصولوں سے ہٹنے کی کسی میں ہمت نہ ہوتی تھی۔

ڈاکٹر آصفہ اس کی بہت مدد کر رہی تھیں۔ اسے گائیڈ کرتیں' ایک ایک بات سمجھاتیں' ان دونوں کا واسطہ خواتین سے ہی پڑتا تھا۔ زیادہ تر خواتین اپنے علاج معالجے سے زیادہ بچوں کا علاج کروانے آتی تھیں۔

وہ یونہی رسما" خالہ امی کو اپنا پتا اور فون نمبر وغیرہ دے کر آئی تھی مگر انہوں نے اس کے آنے کے چھٹے روز یہاں فون کر کے اسے حیران کر دیا تھا۔ اس کی خیریت پوچھنے کے ساتھ ساتھ وہ بہت فکر مندی سے یہاں کے ماحول اور لوگوں کے بارے میں پوچھ رہی تھیں اور ان کی یہ فکر مندی اس کا سیروں خون بڑھا گئی تھی۔ کتنی تقویت اور تحفظ کا احساس میسر آیا تھا ان کی آواز سن کر۔ اسے لگا کہ

یہاں وہ تنہا نہیں' پیچھے کوئی ہے جو اس کے لیے دعا کرے گا' وہ اولاد کے ہاتھوں مجبور ہو گئی ہیں مگر بہرحال کسی بھی مصیبت میں وہ اکیلی تو نہیں ہوں گی۔ وہ ایک دم ہلکی پھلکی اور بہت خوش ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر آصفہ کو اس نے کتنے فخر سے بتایا تھا کہ میری خالہ امی کا فون تھا۔ ایسا کر کے اس کی انا کو کتنی تسکین ملی تھی۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ لاوارث ہے اس کا کوئی گھر در نہیں۔ اس کے دل سے منوں بوجھ ہٹ گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥
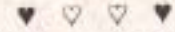
اسے جوائن کیے ایک مہینہ ہونے والا تھا' کسی حد تک اس نے خود کو اس ماحول میں ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ اب سونے لیٹتی تو اکثر فوراً" نیند آجایا کرتی تھی۔ بہت سی بے معنی سوچوں سے اس نے پیچھا چھڑا لیا تھا۔

اس روز اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی' ڈاکٹر شہاب اور ڈاکٹر تاجدار کی ایک ایک ہفتہ نائٹ ڈیوٹی لگا کرتی تھی۔ آج ڈاکٹر شہاب کو اس کے ساتھ نائٹ ڈیوٹی پر ہونا تھا مگر رات میں جب اس کے گھر سے اس کے والد کی بیماری کی اطلاع آئی تو وہ ڈاکٹر شہزور سے اجازت لے کر فوراً" سنگورہ روانہ ہو گیا تھا۔ وہ سسٹر رضیہ اور دوسری جونیئر نرس کے ساتھ ڈیوٹی پر موجود تھی۔ رات کے وقت عموماً" کوئی خاص مشکل کیس نہیں آتے تھے۔ وہ ادھر ادھر سب جگہ کا راؤنڈ لگا کر بچوں کے وارڈ میں آگئی تھی۔

"کیا ہوا سسٹر آپ کو؟" سسٹر رضیہ کو سر پکڑے بیٹھا دیکھ کر وہ فکرمند ہوئی تھی۔

"کچھ نہیں' بس وہی سر درد۔ مصیبت۔" وہ درد سے کراہتی ہوئی بولی تھیں۔ اسے معلوم تھا وہ مگرین کی پرانی مریضہ ہیں۔

"ایسا کریں' آپ جا کر آرام کریں۔ یہاں تو میں ہوں۔ ویسے بھی اب صبح ہونے میں دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔" اس نے گھڑی کی سمت دیکھتے ہوئے کہا جو چار بجا رہی تھی۔ وہ جانے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھیں۔

"آپ اکیلی ہو جائیں گی' ڈاکٹر شہاب بھی نہیں ہیں۔" ڈاکٹرز کے بعد تمام اسٹاف میں وہ سب سے زیادہ تجربہ کار تھیں۔ یہاں کام کرنے سے پہلے بھی انہیں کئی بڑے بڑے ہسپتالوں میں کام کرنے کا وسیع تجربہ تھا۔ کہنے کو وہ صرف نرس تھیں مگر اپنے تجربے کی بدولت فی الحال وہ زوبیہ سے زیادہ معلومات رکھتی تھیں۔

"آپ بے فکر ہو کر جائیں' کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔"

انہیں اطمینان دلا کر رخصت کرنے کے بعد ابھی سکون سے بیٹھی بھی نہیں تھی کہ نرس بھاگتی ہوئی اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"ڈاکٹر! جلدی آئیں' ایک پیشنٹ آئی ہے' کافی سیریس حالت لگ رہی ہے۔" وہ اسٹیتھسکوپ اٹھا کر اس کے پیچھے دوڑی تھی۔ مریضہ کی حالت کافی خراب تھی۔ اسے اسٹریچر سے بیڈ پر منتقل کروا کر وہ فوری طور پر بہتے ہوئے خون کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد خون بہنا تو رک گیا تھا مگر مریضہ کو ہوش نہیں آ رہا تھا۔ اپنے طور پر وہ جتنے جتن کر سکتی تھی سب کر لیے مگر اسے ہوش نہ آیا تو وہ پہلی مرتبہ پیچھے کھڑے اس آدمی کی طرف متوجہ ہوئی جو اسے لے کر آیا تھا۔

"کیا ہوا تھا اسے؟"

"سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔"

وہ گڑبڑا کر بولا تھا۔ اس وقت کھڑے ہو کر اس آدمی سے انکوائری کرنے کا ٹائم نہیں تھا' نہ اس لڑکی کی ہارٹ بیٹ نارمل تھی اور نہ ہی اسے ہوش آ رہا تھا' اس نے فوری طور پر ہاسپٹل فون کر کے ڈاکٹر تاجدار یا سسٹر رضیہ کو بلانے کا سوچا تھا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اسفندیار سسٹر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ اکثر رات کے وقت ہاسپٹل کا چکر لگایا کرتا تھا' بقول ڈاکٹر شہاب چھاپہ مارا کرتا تھا۔ یقیناً" سسٹر اسے کوریڈور میں مل گئی تھی اور اسی نے اسے اس ایمرجنسی کے بارے میں بتایا تھا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھ کر مریضہ کے پاس پہنچا تھا' جلدی جلدی اس کا تفصیلی معائنہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس سے بھی پوچھ رہا تھا کہ اب تک کیا کیا ٹریٹمنٹ دیا جا چکا ہے۔ اکیلے کسی ایمرجنسی سے نمٹنے میں اسے دانتوں پسینہ آگیا تھا۔ کسی سینئر کے ساتھ ہونے میں اور اکیلے سب کچھ سنبھالنے میں کتنا فرق ہے اس نے پہلی مرتبہ اندازہ کیا تھا۔ اپنی کمزوری کا بھی پتا چلا تھا' وہ لڑکی یقیناً" اچانک شاک میں چلی گئی تھی۔ زوبیہ خاموشی سے اسفندیار کو اس کا ٹریٹمنٹ کرتے دیکھ رہی تھی۔

کافی دیر کی کوششوں کے بعد کہیں جا کر لڑکی کو ہوش آیا تھا۔ ہوش میں آتے ہی وہ تکلیف کی شدت سے کراہنے

لگی تھی۔ خون تو اس کے سر میں سے بہہ رہا تھا مگر وہ اپنے دونوں ہاتھوں' کمر اور پیٹ کو پکڑ پکڑ کر کراہ رہی تھی۔ اس کے جسم پر جا بجا نیل پڑے نظر آ رہے تھے' آنکھ بھی سوجی ہوئی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ دواؤں اور انجیکشن کے زیر اثر غافل ہو گئی تو وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔

"آپ ذرا میرے روم میں آیئے۔" نکلنے سے پہلے اس سے کہا گیا تھا۔ وہ پیچھے پیچھے چلتی فوراً اس کے کمرے میں آ گئی تھی۔

"ڈاکٹر شہاب کہاں ہیں؟" کافی سخت لہجے میں دریافت کیا گیا تھا۔

"ان کے گھر سے اطلاع آئی تھی کہ ان کے والد صاحب بیمار ہیں' اس لیے وہ ڈاکٹر شہزور سے چھٹی لے کر چلے گئے تھے۔" وہ اس کے لہجے سے خائف ہوتی نروس سی ہو کر بولی تھی۔

"اور سسٹر رضیہ؟" سرد انداز میں اگلا سوال آیا تھا۔

"وہ ان کو مگرین کی شکایت ہے' آج بھی ان کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا اس لیے میں نے ان سے کہا کہ وہ جا کر آرام کر لیں۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو' بے چاری سسٹر رضیہ کو تھوڑے سے آرام کے بدلے ڈھیر ساری صلواتیں اور ڈانٹیں سننی پڑیں۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔

"اور آپ کو یہ اتھارٹی کس نے دی کہ آپ اس بات کا فیصلہ کریں گی کہ کس کو چھٹی دینی ہے اور کس کو نہیں دینی۔"

بہت گہرا کاٹ دار اور طنزیہ تھا۔

"آپ کو پتا ہے نا' ابھی آپ جونیئر ہیں۔ کسی ایمرجنسی کو اکیلے ہینڈل نہیں کر سکتیں مگر پھر بھی آپ نے رسک لیا۔ چاہے آپ کی ناتجربہ کاری کے ہاتھوں کوئی جان سے چلا جاتا' آپ کی انسانی ہمدردی تو پوری ہو جاتی اور ہاسپٹل کی ریپوٹیشن؟ وہ گئی بھاڑ میں۔ ڈاکٹر شہاب بھی نہیں تھے' کوئی اور ڈاکٹر بھی نہیں تھا اور لے دے کر جو ایک سینئر شخص موجود تھا' اسے آپ نے بڑی شان بے نیازی سے رخصت عنایت کر دی۔"

اب کے آواز بھی تھوڑی سی تیز ہو گئی تھی۔ وہ سر جھکا کر مجرموں کی طرح کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ٹیبل کے پاس کھڑا بول رہا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ ایک گہری سانس لے کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

"یہ آپ کی پہلی غلطی ہے' اس لیے میں اسے اگنور کر رہا ہوں مگر نیکسٹ ٹائم ایسی کسی غلطی کو میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔ کوئی ایمرجنسی ہے' کوئی پرابلم ہے یا جو بھی بات ہے مجھے بتایا جا سکتا ہے' کوئی اور میسر نہیں تھا تو میں آ سکتا تھا۔"

"آئی ایم سوری۔" اس نے کچھ بھی کسی بری نیت سے نہیں کیا تھا مگر غلطی تو بہرحال اس سے ہو گئی تھی۔

"آپ جا سکتی ہیں اب۔" وہ دراز کھول کر اس میں سے کچھ ڈھونڈتے ہوئے بولا تھا۔

"اور ہاں ایک بات۔" وہ دروازے سے نکلنے والی تھی جب پیچھے سے آواز آئی تھی۔ "ایک ڈاکٹر اور ایک عام آدمی میں اتنا فرق تو ہونا چاہیے کہ عام آدمی اگر خون دیکھ کر گھبرا جائے تو ڈاکٹر پرسکون رہے۔ جو مضبوط اعصاب کا مالک نہ ہو وہ ڈاکٹر' کیا ڈاکٹر ہوا۔"

وہ اسی مصروف انداز میں بول رہا تھا۔ وہ چپ چاپ سر جھکا کر کمرے سے نکل آئی تھی۔ شاید اس نے جو کچھ بھی کہا' وہ سب صحیح تھا مگر اسے پھر بھی رونا آ رہا تھا' وہ نالائق ثابت ہوئی تھی۔ اس بات پر اسے رو رو کر خود پر شدید تاؤ آ رہا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥
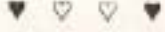
اگلے روز سسٹر رضیہ سے ملاقات ہوئی تو اس نے ڈرتے ڈرتے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تھا مگر وہاں کسی ناراضی کے کوئی آثار نہ تھے۔

"رات کو آپ نے مجھے بھیج دیا اور پیچھے ایمرجنسی ہو گئی' آپ مجھے بلوا لیتیں۔"

انہوں نے خود ہی ذکر نکالا تو وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"آپ کو کچھ کہا ڈاکٹر اسفندیار نے؟ میرا مطلب ہے۔"

وہ کچھ جھجک کر خاموش ہو گئی تھی۔ جواباً" وہ کھل کر مسکرائی تھیں۔ "کافی کچھ کہا مگر بہرحال غلط نہیں کہا۔ آپ نئی ہیں' میرا فرض تھا کہ میں یوں منہ اٹھا کر چلے جانے کے بجائے ڈاکٹر اسفندیار یا ڈاکٹر آصفہ کو بلا لیتی۔" وہ ڈانٹ کھا کر بھی اتنی پرسکون تھیں کہ اسے ان کے سکون پر

حیرت ہوئی' شاید یہ لوگ ڈانٹیں کھا کھا کر ڈانٹ پروف ہو گئے ہیں۔ اس نے آخر کار چڑ کر سوچا تھا۔ رات جس مریضہ کی وجہ سے ان دونوں نے ڈانٹ کھائی تھی' اس کی حالت کل کے مقابلے میں کافی بہتر تھی۔

"کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ؟" وہ راؤنڈ پر آئی تو باقی تمام خواتین مریضوں سے فارغ ہو کر اس کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔

"گر گئی تھی۔" وہ ایک نظر اس پر ڈال کر مختصراً" بولی تھی۔

"لیکن مجھے یہ سیڑھیوں سے گرنے کی چوٹ نہیں لگ رہی اور یہ تمہارے جسم پر نیل کیسے پڑے ہیں؟" اس نے جرح کی تھی۔

"میں تو کہہ رہی ہوں کہ گر گئی تھی۔" وہ چڑچڑے انداز میں بولی تھی مگر لہجہ بہت شکست خوردہ اور بھیگا بھیگا سا محسوس ہوا تھا۔

"دیکھو' مجھے صحیح صحیح بتاؤ۔ کیا ہوا تھا' مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم پر تشدد کیا گیا ہے۔ سچ بتاؤ' تمہیں کس نے مارا تھا' کیا اسی آدمی نے جو رات تمہارے ساتھ تھا' کون تھا وہ تمہارا؟ کیا باپ تھا؟" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دوستانہ انداز میں بولتی ایک سانس میں کئی سوال پوچھ گئی تھی۔

"وہ میرا شوہر تھا۔" اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا تھا۔ اور وہ سکتے کی کیفیت میں منہ کھولے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔

"شوہر؟" اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا' وہ لڑکی کسی بھی طرح پندرہ سولہ سال سے زیادہ عمر کی نہیں تھی اور وہ عمر رسیدہ آدمی جو کسی بھی طرح پچاس سال سے کم نہیں لگتا تھا اس کا شوہر تھا۔ وہ کانپ گئی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں تیرتی حیرت اور تاسف کو استہزائیہ انداز میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں' وہ میرا شوہر ہے اور بہت شوق ہو رہا ہے آپ کو سب کچھ سننے کا تو میں آپ کا شوق پورا کر دوں۔ کل رات میرے شوہر اور ساس دونوں مل کر مجھے مار رہے تھے' وجہ یہ تھی کہ میں نماز پڑھنے لگی تھی اور ساس کو وقت پر کھانا نہیں دیا تھا' دعا مانگتے سے بال پکڑ کر گھسیٹتا ہوا میرا شوہر مجھے ماں کے کمرے میں لے گیا تھا' پھر دونوں نے مل کر مجھے بہت مارا تھا اور مار تو مجھے ہر صورت کھانی ہوتی ہے' کبھی اپنی کسی غلطی پر اور کبھی بنا کسی قصور کے اور سر میرا سیڑھی سے گرنے سے نہیں پھٹا تھا' بلکہ ساس نے سر پر قینچی ماری تھی' شوہر نے پیٹ اور کمر پر لاتیں ماری تھیں۔ منہ پر تھپڑ مارے تھے' اگر خود کو بچانے کی کوشش کروں تو دونوں اور مارتے ہیں اس لیے چپ چاپ مار کھاتی رہتی ہوں' پھر کب مار کھاتے کھاتے میں بے ہوش ہو گئی' مجھے نہیں پتا۔ ہوش آیا تو ہسپتال میں تھی' شاید کل زیادہ ہی چوٹیں آگئی تھیں اسے لگا ہو گا کہ کہیں میں مر مرا نہ جاؤں اس لیے جلدی سے یہاں لے آیا۔"

وہ آنکھ سے آنسو نکالے بغیر اتنے سکون سے سب بتا رہی تھی جیسے یہ کسی اور کی کہانی تھی۔ وہ بری طرح کانپ گئی تھی۔ اتنی سی بچی اور یہ ظلم۔ اف میرے خدا' ابھی تو اس کے کھیلنے اور لائف انجوائے کرنے کے دن تھے' ابھی تو اسے رنگوں' پھولوں اور تتلیوں کی باتیں کرنی چاہیے تھیں اور وہ؟ کتنا ظلم ہو رہا تھا اس معصوم لڑکی پر۔

"اور تمہارے ماں باپ' وہ کچھ نہیں کہتے داماد کو؟" کافی دیر بعد وہ خود کو بولنے پر آمادہ کر پائی تھی۔ "وہ کیا کہیں گے۔ میرے باپ پر قرض چڑھا ہوا تھا بہادر خان کا وہ بھی پورے دس ہزار روپے کا۔ کہاں سے لاتا وہ دس ہزار روپے۔ خود کو بیچ دیتا تب بھی پیسے نہ لا پاتا۔ بہادر خان کا دل ویسے بھی اپنی پہلی بیوی سے کچھ بیزار ہو گیا تھا اس لیے مل بیٹھ کر پیسوں کی جگہ ابا نے مجھے پیش کرنے کا فیصلہ کیا بہادر خان کو۔"

اس کی آنکھوں میں تیرتا درد دیکھ کر اس کا دل بھر آیا تھا۔ کتنی دیر تک وہ زار و قطار روتے ہوئے اسے خود پر بیتا ہر ستم بتاتی رہی تھی۔ وہ اتنی حسین سی خجستہ کیا اس سلوک کی مستحق تھی' اسے رنج اور افسوس کے ساتھ ساتھ اس کے شوہر' ساس اور باپ پر شدید غصہ بھی آرہا تھا۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ ان ظالموں کا سر کچل کر رکھ دے۔

♥ ♡ ♡ ♥

"بیڈ نمبر فور پر کل جو بچہ ایڈمٹ ہوا تھا' یہ اس کے بلڈ ٹیسٹس کی رپورٹس ہیں۔" اسفندیار کے کمرے میں داخل ہو کر اس نے رپورٹس اس کی ٹیبل پر رکھی تھیں'

تھوڑی دیر پہلے ہی اسفندیار نے اسے انٹرکام پر رپورٹس لانے کے لیے کہا تھا۔ وہ رپورٹس اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھنے لگا تھا۔

"بیٹھیے۔" کاغذوں پر نظریں جمائے جمائے اسے بیٹھنے کے لیے کہا گیا تو وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

"کیا diagnose (تشخیص) کیا آپ نے رپورٹس دیکھ کر؟ کل سے اب تک ہم نے جو ٹریٹمنٹ کیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں؟" رپورٹس پیپر ویٹ کے نیچے دباتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"رپورٹس تو بالکل ٹھیک ہیں۔ میرا خیال ہے' میڈیسن چینج کر کے دیکھنا چاہیے۔"

ہزار کوشش کرتی تھی کہ اس کے سامنے نروس نہ ہو مگر نجانے کیا ہوتا تھا' وہ اس کے آگے اعتماد سے بات نہیں کر پاتی تھی۔ حالانکہ ڈاکٹر شنور اور ڈاکٹر آصف اس سے بھی زیادہ سینئر ڈاکٹرز تھے مگر ان کے آگے وہ کبھی بھی نروس نہیں ہوتی تھی۔ دوسری طرف اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے صرف گردن ہلانے پر اکتفا کیا گیا تھا۔

"پرسوں رات جو لڑکی ایڈمٹ ہوئی تھی' اس کا کیا حال ہے؟"

اس کے پوچھنے پر زوبیہ نے بڑا اطمینان محسوس کیا تھا' کل جب سے وہ خجستہ کے پاس سے ہو کر آئی تھی اسفندیار سے اس کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھی۔ سارے زمانے پر رعب رکھتے ہیں۔ ذرا اس کے شوہر کی کھنچائی تو کریں۔

"پہلے سے بہتر ہے' کافی ری کور کیا ہے اس نے۔"

"ویری گڈ۔" وہ ریسیور اٹھا کر جو لایا' بولا تو وہ فوراً" بول پڑی۔

"مجھے آپ سے اس کے بارے میں ایک بات کرنی تھی۔" نمبر ملاتے اس کے ہاتھ بے ساختہ رک گئے تھے۔

"کہیے۔" ریسیور واپس رکھ کر وہ پوری طرح متوجہ ہو گیا تھا۔

"پرسوں جو آدمی اسے لایا تھا' وہ اس کا شوہر تھا اور آپ کو معلوم ہے وہ مکار آدمی جھوٹ بول رہا تھا کہ خجستہ سیڑھیوں سے گر گئی ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ وہ اور اس کی ماں دونوں نے مل کر بے چاری کو بہت بری طرح مارا پیٹا تھا' آپ نے شاید نوٹ کیا ہو اس کی آنکھ کیسی سوج رہی تھی اور جسم پر جگہ جگہ نیل پڑے نظر آرہے تھے۔"

وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے روانی سے بولتی چلی گئی تھی۔ وہ جو بہت سنجیدگی سے اس کی بات سن رہا تھا' ایک دم ڈھیلے ڈھالے انداز میں کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے بولا۔

"آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہیں' یہ ان کا پرسنل معاملہ ہے۔ اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔"

"تعلق کیسے نہیں ہے۔ ابھی ہم اس کا علاج کر دیں گے' پھر یہاں سے نکل کر اسی جہنم میں بھیج دی جائے گی وہاں پھر وہی ظلم و ستم ہوں گے اس پر' اگر ایسا ہی ہے تو ہمیں اس کا علاج کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ اچھا ہے' وہ بغیر علاج کے مر جائے۔ کم از کم اس روز روز کے ظلم سے تو اس کی جان چھوٹ جائے گی۔"

وہ پہلی مرتبہ بغیر نروس ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تھی۔ دل ہی دل میں اس کی بے حسی پر تاؤ بھی آرہا تھا۔ ویسے تو بہت لیکچر دیا جا رہا تھا کہ دوسروں کے دکھ' درد کو اپنے دل میں محسوس کر کے ہی اپنے پیشے کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔

"آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟" وہ اسی پر سکون انداز میں بولا تھا۔

"آپ اس کے شوہر کو بلا کر ذرا ڈانٹ ڈپٹ کریں' آپ کو پتا ہے شوہر کی مار پیٹ کی وجہ سے اس کا دو مرتبہ ابارشن ہو چکا ہے۔" وہ جوابا" سنجیدگی سے بولی تھی۔

"بات یہ ہے ڈاکٹر زوبیہ خلیل کہ ہمارا کام مریضوں کا علاج معالجہ کرنا ہے' مانا کہ یہ ہاسپٹل میں نے خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر بنایا تھا مگر ہاسپٹل کے اندر حقوق نسواں قسم کا کوئی ذیلی ادارہ بنانے کا میرا کوئی پروگرام نہیں۔ اگر کسی کا شوہر اسے مارتا پیٹتا ہے تو یہ ان کا گھریلو معاملہ ہے اور اس میں ٹانگ اڑانے کا مجھے یا آپ کو کوئی حق نہیں۔ آپ کے لیے بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ اپنے پروفیشن میں دلچسپی لیں' یہ سوشل ورک' تنظیم آزادی خواتین اور وومن فریڈم اور وومن رائٹس پر کام کرنے کے لیے پہلے ہی کافی لوگ موجود ہیں۔"

وہ سنجیدگی سے بولا تھا مگر آنکھوں سے جھانکتی استہزائیہ مسکراہٹ اس کی نگاہوں سے مخفی نہیں رہ سکی تھی۔ اسے جواب دے کر وہ دوبارہ ٹیلی فون کی طرف توجہ کرچکا تھا۔ جلتے بھنتے وہ کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ کتنا فرق ہوتا ہے لوگوں کے قول اور فعل میں۔ سب کتنی تعریفیں کرتے ہیں ڈاکٹر اسفند' ڈاکٹر اسفند' جسے دیکھو اسی نام کی مالا جپتا رہتا ہے اور وہ موصوف کتنے سفاک اور بے رحم انسان ہیں۔ نہیں کرتے نہ کریں اس کے شوہر سے بات میں خود ہی کرلوں گی۔

رات میں وہ خجستہ کے پاس آئی اور اس سے بھی یہی بات کی تو وہ بری طرح ڈر گئی۔

"آپ اس سے کچھ مت بولیے گا' وہ مجھے اور مارے گا۔"

"ارے کیسے مارے گا' میں اس کا دماغ ٹھیک کردوں گی' اور تم بھی بلاوجہ دہشت مت کرو۔ بڈھا کھوسٹ تو ہے اب کے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ہاتھ پکڑ لینا۔" وہ جوشیلے انداز میں بولی تھی' اس کی بات پر وہ روتے روتے ہنس پڑی تھی۔

"میں تو ایسا کبھی بھی نہیں کرسکتی لیکن مجھے لگتا ہے آپ اپنے شوہر سے کبھی نہیں ڈریں گی۔ بلکہ وہ بے چارہ آپ سے ڈرا کرے گا۔" وہ بے تکلفانہ انداز میں اس سے بات کرنے لگی تھی' اس کی بے تکلفی سے کی گئی یہ بات ایک پل کے لیے اسے سن کر گئی تھی' کیا میری زندگی میں ایسے کسی شخص کی آمد ہوسکتی ہے' کیا کوئی میرے لیے بھی بنایا ہوگا اللہ نے۔ کہیں کوئی چھاؤں میرے نام کی بھی ہوگی؟ وہ ایک دم چپ سی ہوگئی تھی۔

خجستہ اتنی زیادہ ڈر رہی تھی کہ وہ براہ راست اس کے شوہر سے باز پرس نہیں کرسکی تھی مگر دبے لفظوں میں اس نے اسے سرزنش ضرور کی تھی۔

"اتنی کمزور ہے یہ' تمہیں اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ اتنی خوب صورت اور کم عمر بیوی ملی ہے تو اس کی قدر تو کرو۔" وہ اس کی تمام ہدایات سر جھکا کر سنتا رہا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥
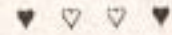
اپنی پہلی تنخواہ ملنے پر اس نے خالہ امی کو پیسے بھی بھجوائے تھے اور ایسا کرکے اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ ان کے گھر کے حالات اس سے پوشیدہ تو نہیں تھے' پہلوان پیسوں سے وہ شہلا کے جہیز کے لیے کچھ نہ کچھ خرید لیں گی۔ اپنی محنت کی کمائی کسی اپنے پر خرچ کرنے میں اسے روحانی مسرت حاصل ہوئی تھی۔

کافی دیر تو وہ بستر پر پڑی کروٹیں بدلتی رہی۔ تنگ آکر وہ ہاسٹل سے باہر نکل آئی تھی۔ اتنے دنوں میں وہ آج پہلی مرتبہ اس طرح باہر نکلی تھی۔

باہر نکلی تو احساس ہوا کہ وہ آج کتنے دنوں بعد کھلی فضا میں سانس لے رہی ہے۔ یونہی موسم انجوائے کرتے کرتے وہ کافی آگے نکل آئی تھی۔

"سائم! ذرا ان پھولوں کے پاس میری ایک تصویر لو۔" ایک خوب صورت نسوانی آواز نے اسے چونکایا تھا۔ ادھر ادھر کوئی نظر تو نہیں آرہا تھا مگر آواز کہیں پاس سے ہی آتی سنائی دی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور جھک کر دیکھا تو اس ڈھلان کے کافی نیچے کھڑے ایک لڑکا اور ایک لڑکی اسے نظر آ ہی گئے تھے۔

"اور کتنی تصویریں کھنچواؤ گی کشمالہ! میں تھک گیا ہوں۔" لڑکا بے زاری سے بولا تھا۔

"پتا نہیں تمہارا فوٹو سیشن کب ختم ہوگا۔ تمہاری دوستوں کو یہاں کی تصویریں دیکھنے کا شوق ہے یا تمہاری ماڈلنگ' میں تو تنگ آگیا' اب بس درخت پر بندروں کی طرح لٹک کر تصویر کھنچنی رہ گئی۔ باقی تو ہر پوز ہوگیا۔" وہ غصے سے چلایا تھا۔

"اچھا تم رہنے دو' میں گل ریز سے کھنچوالوں گی۔ وہ چار تصویریں کیا کھینچ دیں' دماغ ہی خراب ہوگیا۔" وہ جواباً ناراضی سے بولتی مڑی تو نظریں سیدھی اس پر پڑی تھیں۔ زوبیہ دوستانہ انداز میں مسکرادی تھی۔

"ہیلو!" وہ لڑکے کو چھوڑ چھاڑ تیزی سے اوپر چڑھتی ہوئی اس کے پاس آگئی تھی۔

"ہیلو!" مسکراتے ہوئے اس نے اس کا مصافحہ کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا تھا۔ لڑکا وہیں کھڑا ان دونوں کو تعجب سے دیکھ رہا تھا۔

"میں کشمالہ ہوں' کشمالہ اردشیر خان اور آپ؟" بڑے مہذب انداز میں انگلش میں سوال کیا گیا تھا۔

"میں زوبیہ خلیل ہوں۔" لڑکا بھی ان لوگوں تک پہنچ چکا تھا۔

"زوبیہ خلیل۔" وہ اس کا نام دہراتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ "آپ کا نام سنا ہوا لگ رہا ہے۔"

"ہاں شاید تم نے کسی سے سنا ہو' میں یہاں ہاسپٹل میں نئی اپائنٹ ہوئی ہوں۔" وہ خوش دلی سے مسکرادی تھی۔

"اوہ تو آپ ہمارے علاقے کی نئی لیڈی ڈاکٹر ہیں۔" وہ خوش ہوکر بولی تھی' اس نے مسکراتے ہوئے گردن ہلادی تھی۔

"ویلکم ڈاکٹر زوبیہ' بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ بائی دا وے میں سائم اردشیر خان ہوں۔" وہ لڑکا کچھ چڑ کر بولا تھا' شاید اسے اپنا اتنی دیر سے نظر انداز کیا جانا پسند نہیں آرہا تھا۔

"ہاں' یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ بے چارے کو جلنے کلسنے کی پرانی بیماری ہے۔" وہ سائم کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی' انداز سراسر چڑانے والا تھا۔

"ہاں یہ موٹی میری بڑی بہن ہے۔ بی بی جان اسے چکنا گھڑا کہتی ہیں' کچھ کہہ لو اثر نہیں ہوتا' تب ہی تو موٹاپا دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔" جوابی کارروائی فوراً ہوئی تھی۔ وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"اب تم لوگ لڑنا مت شروع کردینا۔"

"کہاں پڑھتی ہو تم؟"

"میں ڈاؤ میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہوں۔ فرسٹ ایئر میں ہوں۔" اس نے سادگی سے بتایا تھا۔

"اوہ ڈی ایم سی میں' زبردست' میں نے بھی وہیں سے پڑھا ہے۔" وہ اپنے تعلیمی ادارے کا نام سن کر خوش ہوگئی تھی' سائم بھی انہیں لوگوں کے پاس بیٹھ گیا تھا۔

"آپ کراچی سے آئی ہیں؟" وہ حیران ہوکر پوچھ رہا تھا۔

"نہیں آئی تو میں پشاور سے ہوں۔ پہلے کراچی میں رہتی تھی۔ "میرے پیرنٹس کی ڈیتھ ہوگئی تو میں اپنی خالہ کے پاس پشاور میں رہنے لگی تھی۔" وہی رٹا رٹایا جواب جو وہ ڈاکٹر لوگوں کو دیا کرتی تھی اس نے اسے بھی دیا تھا۔

"پڑھائی کی وجہ سے تم لوگوں کو یہاں سے بھیجا ہوگا تمہارے پیرنٹس نے۔"

"فادر کی تو ہمارے ڈیتھ ہوچکی۔ بس ممی ہیں' لالہ ہیں اور بی بی جان ہیں اور ان تینوں ہی کو ہمیں بہت سارا پڑھانے لکھانے کا بہت زیادہ شوق ہے۔" کشمالہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

"چپ تم کھائیں گی آپ؟" ان دونوں کا سنجیدہ منہ دیکھ کر سائم نے ماحول میں کھلی افسردگی کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ کشمالہ اپنے باپ کو شاید بہت زیادہ مس کرتی ہے' اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی چھلکنے لگی تھی صرف ان کا ذکر کرنے پر ہی۔

وہ دونوں' بہن بھائی بہت زندہ دل اور ہنس مکھ تھے اور اسے اتنے دنوں بعد کچھ مختلف قسم کی کمپنی میسر آئی تھی اس لیے بہت مزہ آرہا تھا۔ وہ ڈھائی گھنٹے ان لوگوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کس طرح گزر گئے تھے اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

ان سے رخصت ہوکر واپس ہاسٹل آئی تو دیر تک بیٹھی ان دونوں بہن بھائی کی شرارتوں کو یاد کرکے انجوائے کرتی رہی۔

♥ ♡ ♡ ♥
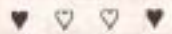
اگلے روز وہ ڈاکٹر شنور کے ساتھ بچوں کے وارڈ کا

راؤنڈ لگا کر واپس آرہی تھی جب اطلاع ملی کہ اس سے ملنے کوئی آیا ہے۔ "کون آگیا؟" وہ حیران پریشان اپنے کمرے کی طرف آئی تھی ڈاکٹر شہزور اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

"ارے تم لوگ!" سائم اور کشمالہ کو کمرے میں بیٹھا دیکھ کر اسے خوشی تو ہوئی تھی مگر ساتھ ہی اسفندیار کا خوف بھی لاحق ہوا تھا۔

"لگتا ہے آپ ہمیں دیکھ کر خوش نہیں ہوئیں۔" کشمالہ نے اس کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے شکوہ کیا تھا۔

"نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں، تم لوگوں کو دیکھ کر تو میں بہت خوش ہوئی ہوں، بس یار مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ہاسپٹل میں ڈسپلن کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہے۔ ڈیوٹی آورز میں ذاتی میل جول پر سخت پابندی ہے۔" وہ اپنی سیٹ سنبھالتے ہوئے مسکرا کر وضاحت کرنے لگی۔

"اف اتنی سختی۔" سائم نے جھرجھری لی تھی۔

"ارے یہ تو کچھ بھی نہیں۔ تم ایک پورا دن یہاں گزار کر دیکھو، مری کانوینٹ کی سختیاں بھول جاؤ تو میرا نام زوبیہ خلیل نہیں۔" وہ بڑے مزے سے بولی تھی۔

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ آپ کسی سے مل بھی نہیں سکتیں، آپ لوگ ایڈمنسٹریشن کے خلاف پروٹسٹ کیوں نہیں کرتے۔" کشمالہ نے اسے بغاوت پر اکسایا تھا۔

"ابھی بچو! تم نے ہمارے بگ باس کو نہیں دیکھا۔ اس لیے بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہے ہو۔ ہٹلر کو جانتے ہو؟" اس نے سنجیدگی سے دریافت کیا تو ان دونوں نے گردنیں ہلا دی تھیں۔

"بس اسی سے جا کر سلسلہ نسب ملتا ہے۔ ڈاکٹر اسفندیار خان کا۔" وہ ڈرانے والے انداز میں بولی تو کشمالہ بے ساختہ مسکرا دی تھی۔

"اتنے خطرناک آدمی ہیں وہ؟"

"صرف خطرناک نہیں، ہیبت ناک، وحشت ناک، دہشت ناک، بس یار! سمجھو جتنے بھی ناک ہیں وہ سب وہی ہیں۔ اس لیے اب تم دونوں یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ، دو گھنٹے بعد میری ڈیوٹی آف ہونے والی ہے، اگر تم لوگ فارغ ہو تو دو گھنٹے بعد کل والی جگہ پر ہی ملتے ہیں۔"

یہاں آنے کے بعد اس نے پہلی مرتبہ کسی کو اسفندیار کے بارے میں کوئی کمنٹس دیے تھے اور اپنی باتوں کو خود ہی انجوائے بھی کیا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ مل کر ایسی بچکانہ باتیں کرنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ دونوں دو گھنٹے بعد ملنے پر اتفاق کرتے ہوئے مسکرا کر اٹھ گئے تھے۔

"آپ کے ساتھ کیا کوئی پرابلم ہے؟" اسفندیار کے کہنے پر اس نے کچھ چونک کر فوراً گردن نفی میں ہلائی تھی۔

"پھر آپ میری بات توجہ سے کیوں نہیں سن رہیں، بار بار گھڑی کی طرف دیکھنے کا کیا مقصد ہے؟" وہ لوگ جنرل وارڈ میں کھڑے تھے اس نے مریضوں کے سامنے ہی اس سے سخت لہجے میں کہا تھا۔ حالانکہ اس نے کتنی احتیاط سے بالکل چپکے سے رسٹ واچ پر نظر ڈالی تھی مگر اسے پتا نہیں کیسے پتا چل گیا تھا۔ وہ اس ضعیف مریضہ کی مختلف رپورٹس دیکھتے ہوئے اسے اور ڈاکٹر شباب کو مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ سسٹر رضیہ بھی بائیں طرف کھڑی ہدایت نامہ سن رہی تھیں۔

"کیا بتایا ہے ابھی میں نے کون سی میڈیسن دینی ہے رات میں سونے سے پہلے۔"

وہی انداز جیسے اسکول میں ٹیچر کسی شاگرد کی بے توجہی محسوس کر کے اپنی کہی بات دہرانے کا حکم صادر کرتے تھے۔ اب خیر وہ اتنی غائب دماغی سے تو نہیں کھڑی تھی، بے شک اسے ان لوگوں سے ملنے جانے کی جلدی تھی مگر اس کی تمام باتیں تو اس نے بالکل توجہ سے سنی تھیں۔ اس کے منہ سے دوا کا صحیح نام سن کر وہاں غصہ تھوڑا کم ہو گیا تھا ورنہ آثار بتا رہے تھے کہ یہیں گرج چمک ہونے والی تھی۔ وارڈ سے نکل کر وہ تینوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کوریڈور میں آئے تو اس کی طرف سر گھما کر اسفندیار بولا۔

"آپ کا ڈیوٹی ٹائم ختم ہو گیا تھا۔ میں مانتا ہوں مگر مجھے پھر بھی یہ انداز پسند نہیں۔ میرے سامنے بار بار گھڑی دیکھ کر کوئی مجھے امپریس کرنے یا بہت بزی ہونے کا تاثر دے تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ آئی ہوپ آئندہ آپ احتیاط کریں گی۔"

اپنے مخصوص صاف گو اور روڈ انداز میں بات مکمل کی گئی تھی۔ اس کا موڈ بہت بری طرح آف ہو گیا تھا، ذرا سی

کرائی کیا، کچھ بلی، موصوف نے اتنی باتیں سنا دیں، "اسے غصہ آیا تھا" اس سے پہلے کب اس نے وقت کی پروا کی تھی "الٹا وہ تو دوسروں کے حصے کی بھی ڈیوٹی دے دیا کرتی تھی، کبھی اس کی تعریف نہیں ہوئی، ذرا سی گھڑی دیکھنے پر اتنی باتیں سنا دیں۔ ان لوگوں سے وعدہ نہ کیا ہوا ہوتا تو وہ اب کہیں بھی جانا ملتوی کر دیتی مگر پہلے ہی وہ اپنے وعدے سے پون گھنٹہ لیٹ ہو گئی تھی۔ اس بات کا یقین بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ ابھی تک وہاں انتظار کر رہے ہوں گے یا تھک ہار کر واپس گھر چلے گئے ہوں گے مگر پھر بھی اسے جانا تو ضروری تھا۔

"بڑی جلدی آ گئیں آپ۔ اتنی جلدی آنے کی بھی کیا ضرورت تھی، کم از کم تھوڑا بہت انتظار ہی کروا دیتیں۔" سائم کے طنزیہ انداز پر وہ وارننگ دینے والے انداز میں انگلی اٹھا کر بولی۔

"پہلے ہی تم دونوں کی وجہ سے ڈانٹ کھا کر آ رہی ہوں، لہٰذا اب یہ طنز اور طعنے دے دے کر مجھے مزید طیش مت دلاؤ۔"

"آپ کو ڈانٹ پڑی، کس نے ڈانٹا؟" دونوں بضد ہوئے تو اس نے من و عن سارا واقعہ کہہ سنایا۔

"آئندہ میری توبہ، جو میں بھی گھڑی پہنوں، نہ گھڑی ہاتھ میں ہو گی نہ اس پر نظر پڑے گی۔" بات مکمل کرتے ہوئے اس نے باقاعدہ کان پکڑ کر توبہ کی تھی۔

"بہت فضول آدمی ہیں، اتنی سی بات پر طوفان اٹھا دیا۔" کشمالہ نے رائے زنی کی تو وہ منہ بگاڑ کر بولی۔

"چھوڑو دفع کرو اس ذکر کو، کیوں ہم فضول میں ان کا ذکر کر کے اپنا خون جلائیں۔"

کشمالہ گھر سے چیز سینڈوچز اور تھرماس میں کافی بھر کر لائی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے ان تینوں نے سینڈوچز اور کافی سے بھرپور انصاف کیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

خجستہ کو ہاسٹل میں اپنے کمرے میں موجود پا کر اسے بے پایاں مسرت ہوئی تھی۔

"کیسی ہو تم؟ میں تم سے ملنے آنا چاہ رہی تھی، کئی بار سوچا مگر سچ پوچھو تو تمہاری ساس اور شوہر سے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بیڈ پر بٹھاتے ہوئے گرم جوشی سے بولی۔

"مجھے تو بہت سمجھا رہی تھیں کہ شوہر سے ذرا مت کرو، مارے تو اس کا ہاتھ پکڑ لو اور خود اتنی ڈرپوک ہیں کہ میرے گھر آنے سے بھی ڈر رہی تھیں۔" وہ شکایتی انداز میں بولی پھر کچھ خیال آنے پر مزید گویا ہوئی۔

"میرا دیور یہاں مالی کا کام کرتا ہے، اس کے لیے کھانا لانے کا بہانہ کر کے آئی ہوں ورنہ اماں تو مجھے گھر سے باہر قدم نہ رکھنے دے۔ دیور میرا بہت اچھا ہے۔ میرا خیال رکھتا ہے۔ اسے کھانا دے کر میں نے بتا دیا کہ میں آپ کے پاس جا رہی ہوں، برتن واپس لے کر جاؤں گی۔"

"تم نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ تمہارا دیور یہاں کام کرتا ہے ورنہ میں ہمت کر کے اسی کے ساتھ تمہارے گھر آجاتی، کسی بھی بہانے سے۔"

اس کے کہنے پر وہ شرمندگی سے سر ہلا کر بولی۔ "ہاں یہ بتانا مجھے یاد نہیں رہا۔"

"تم آرام سے تو بیٹھو، اچھا یہ بتاؤ کیا کھاؤ گی؟" اسے مہمان نوازی نبھانے کا خیال آیا تھا۔

"کچھ بھی نہیں، بس میں تو آپ سے ملنے آئی ہوں، آپ سے باتیں کرنا بہت اچھا لگتا ہے جو باتیں میں کسی سے بھی نہیں کرپاتی، آپ سے کہہ دیتی ہوں اور آپ میری باتیں پیار سے سن لیتی ہیں۔"

اس کے کہنے پر وہ تھوڑی سی افسردہ ہو گئی۔

"ہاں بس سن سکتی ہی ہوں، بہت سے بہت جواب میں لمبی سی تقریر جھاڑ دیتی ہوں، بات تو تب ہے اگر میں تمہاری عملی مدد کروں۔"

"میرے لیے یہ بھی بہت ہے، میرے پاس تو ایسا بھی کوئی نہیں جس سے میں اپنے دل کی باتیں کہہ سکوں۔" وہ بولی۔

"میں چلتی ہوں، دیر ہو گئی تو اماں چھوڑے گی نہیں۔" وہ دس منٹ بیٹھ کر ہی اٹھ گئی۔ اسے رخصت کرنے وہ ہاسپٹل کے گیٹ تک آئی اس کے دیور سے بھی سلام دعا ہوئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد بھی کتنی دیر تک اس کے ذہن میں اس کی آواز گونجتی رہی تھی۔

"دن میں مارتا ہے، رات کو اچانک اسے مجھ پر پیار آجاتا ہے، میرا بس چلے تو میں ایسی جگہ چلی جاؤں جہاں کبھی بھی اس کی شکل تک نظر نہ آئے۔"

اپنے زخم دکھاتے ہوئے اس نے کس طرح روتے

ہوئے یہ بات کی تھی' وہ ہاسپٹل میں آکر اور مریضوں کے ساتھ مصروف ہو جانے کے باوجود اسی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ پتا نہیں ہر بار خجستہ کو دیکھنے کے بعد اسے چودہ پندرہ سال کی زوبیہ خلیل کیوں یاد آجاتی تھی۔ حالانکہ دونوں کے حالات میں زمین آسمان کا فرق تھا مگر پھر بھی پتا نہیں کیوں۔ لیکن شاید ایک بات خجستہ اور اس زوبیہ خلیل میں مشترک تھی اور وہ تھی زندگی سے مایوسی' اندر ہی اندر مرنا اور ختم ہو جانا' کسی سے کچھ بھی نہ کہہ سکنا' خجستہ کا جسم زخمی ہوتا تھا اور اس کی روح پر تازیانے پڑتے تھے۔

"بہادر کو میرے کردار پر شک ہے' وہ کہتا ہے میں بد چلن اور آوارہ ہوں' نہا کر صاف کپڑے پہن لوں تو گالیاں دینا شروع ہو جاتا ہے' ذلیل عورت کسے دکھانے کے لیے اتنا سجی ہے۔"

"اب کی بار کلاس فیلو سے چکر چلایا ہے' پتا نہیں ایسی لڑکیوں میں کیا کشش ہوتی ہے جو مرد اس طرح ان کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔"

برسوں پرانے زخم پھر سے تازہ ہونے لگے تھے' وہ اس رات تکیے میں منہ دے کر گھنٹوں روئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥
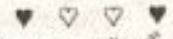
تین چار دن ہو گئے تھے اسے کشمالہ اور سائم سے ملے ہوئے۔ "شاید وہ لوگ واپس چلے گئے ہوں۔" اس نے سوچا تھا مگر کمرے کی کھڑکی سے کشمالہ کو اس طرف آتا دیکھ کر اس کی سوچ غلط ثابت ہو گئی تھی۔ اس کے کمرے کی کھڑکی باغ میں کھلتی تھی اور ہاسپٹل کی بیک سائیڈ بھی وہ یہاں سے کھڑے کھڑے اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔

"تو ابھی میں سمجھی تم لوگ واپس چلے گئے۔" وہ اسے آتا دیکھ کر باہر نکل آئی۔

"گئے نہیں' لیکن جانے والے ہیں کل' اسی لیے ہم نے سوچا' جانے سے پہلے آپ سے ملتے جائیں' پہلے میں ہاسپٹل گئی۔ پتا چلا آپ کی نائٹ ڈیوٹی تھی اور اب آپ ہاسٹل میں آرام فرما رہی ہیں۔" وہ جلدی جلدی بول رہی تھی یوں جیسے کہیں بھاگنے کی تیاری ہو۔

"چلو' اندر چل کر بیٹھتے ہیں' اور یہ سائم نظر نہیں آ رہا؟" وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی تھی۔

"سائم گھر پر ہے' کہہ رہا تھا کہ اگر آپ نے آنے سے منع کر دیا تو اسے بہت برا لگے گا' اس لیے وہ گھر پر رک گیا۔" اس کی حیران شکل دیکھ کر وہ وضاحتی انداز میں بولی۔

"آج آپ کو ہم لوگوں کے ساتھ لنچ کرنا پڑے گا اور وہ بھی بغیر کوئی بہانا بنائے۔ میں نے اسپیشلی آپ کی وجہ سے ممی سے لنچ پر خوب سارا اہتمام کروایا ہے' آپ اگر آپ نہیں گئیں تو ممی کے سامنے میری پوزیشن کتنی آکورڈ ہو جائے گی' اور بی بی جان جو گھر پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں کیسی کی کہ تمہاری زوبیہ آپی اتنی نخریلی ہیں۔" وہ بڑی مہارت سے جذباتی بلیک میلنگ کرنے میں مصروف تھی۔

"مجھے جانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے کشمالہ! لیکن اس طرح جانا اچھا نہیں لگتا' تم لوگ اگلی بار چھٹیوں میں آؤ گے تو انشاء اللہ تمہارے گھر ضرور آؤں گی۔" وہ اس کے گال تھپتھپا کر بولی تو کشمالہ اس کا ہاتھ جھٹک کر ایک دم واپس مڑ گئی۔

"ارے کشمالہ! میری بات سنو' پلیز رکو تو سہی۔" وہ اسے آوازیں دے رہی تھی مگر وہ بغیر مڑے اندھا دھند بھاگی چلی جا رہی تھی۔

"اچھا' میں آ رہی ہوں۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں چلائی تو کشمالہ نے اچھل کر "یاہو" اور "ہرے" کے نعرے لگائے تھے۔

"پتا تھا' مجھے آپ کبھی بھی میری بات نہیں ٹال سکتیں' یو آر سو سوئیٹ زوبیہ آپی۔"

"اچھا اب زیادہ مکھن لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس طرح منہ اٹھا کر کسی کے گھر جانا اسے بالکل پسند نہیں تھا مگر وہ جذباتی اور بے وقوف کشمالہ اسے کون سمجھا سکتا تھا۔

"آپ کو ڈریس چینج کرنا ہے تو کر لیں۔ میں انتظار کر لوں گی۔" اس نے پیشکش کی تو وہ انکار میں سر ہلا کر چادر اوڑھتی ہوئی اس کے ساتھ گیٹ سے باہر نکل آئی تھی۔ ان دونوں کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

"تمہارے گھر میں کون کون رہتا ہے؟" اسے نئے لوگوں سے ملنے میں عجیب سی ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔

"صرف میں' سائم' ممی' بی بی جان اور لالہ بھی

اس وقت گھر پر نہیں ہوں گے۔" وہ اس کے گریز کی وجہ سمجھتے ہوئے تسلی کروانے والے انداز میں بولی تھی۔

دور سے دیکھنے میں وہ جگہ جتنی اچھی لگی تھی' قریب سے اس سے بھی زیادہ خوب صورت تھی۔ وہ ہری بھری سرسبز پہاڑی اور اس پر بنا وہ شاندار مکان جو اپنے خوب صورت اور اسٹائلش انداز کی بدولت فوراً ہی دیکھنے والے کی توجہ کھینچ لیا کرتا تھا۔ روڈ پر سے ہوتی ہوئی گاڑی اس سلوپ پر چڑھ گئی تھی جو بالآخر مکان کے مرکزی گیٹ کے سامنے جا کر ختم ہوا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اس کے گھر کی تعریفیں بھی کرتی جا رہی تھی' گاڑی کی آواز سنتے ہی سائم پتا نہیں ایک دم کہاں سے نمودار ہو گیا تھا۔

"شکر آپ آگئیں' ورنہ آج ممی اور بی بی جان کے سامنے ہم دونوں کی بہت انسلٹ ہوتی۔"

وہ بھی کشمالہ ہی کی طرح اس کے آنے پر بے تحاشا خوش تھا۔ کیا لگتی تھی وہ ان لوگوں کی مگر وہ لوگ اسے یوں چاہ رہے تھے۔ جیسے برسوں پرانی شناسائی ہے' اندر داخل ہو کر پتھری روش پر چلتے وہ لوگ داخلی دروازے کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ دروازہ کھول کر کشمالہ نے اسے اندر داخل ہونے کے لیے کہا تو کچھ جھجکتے ہوئے اس نے قدم آگے بڑھائے تھے۔

"دیکھیں بی بی جان! یہ ہیں زوبیہ آپی' ہماری نئی فرینڈ۔" کشمالہ نے لاؤنج میں گھستے ہی نعرہ لگایا تھا۔ سامنے صوفے پر دو خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ سفید چکن کی شلوار قمیص اور کڑھے ہوئے دوپٹے کے ساتھ ذرا بھاری جسم والی' ان لوگوں کی بی بی جان تھیں اور کشمالہ ہی کی طرح نیلی آنکھوں اور ٹھوڑی پر ڈمپل والی ان دونوں کی ممی۔

"بہت تعریف کر رہے تھے یہ لوگ تمہاری۔" بی بی جان نے اسے پیار سے گلے لگاتے ہوئے کہا تھا۔ ان لوگوں کی ممی نے گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے بیٹھنے کی آفر کی تھی۔

اب تک اس نے صرف کتابوں میں پڑھا تھا کہ پہاڑوں پر رہنے والوں کے دل بھی پہاڑوں جتنے بڑے ہوتے ہیں مگر یہاں آکر وہ قدم قدم پر اس تجربے سے گزر رہی تھی۔ ہر کوئی اتنی محبت سے ملتا کہ وہ حیران رہ جاتی۔

ڈاکٹرنی' ڈاکٹرنی کہہ کر اسے عزت دی جاتی۔ وہ ان لوگوں کی محبت اور اپنائیت سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ بی بی جان نے بڑی محبت سے اسے اپنے برابر بٹھا لیا تھا۔ وہ جو آتے وقت جھجک رہی تھی ایک دم پُرسکون ہو گئی تھی' ان لوگوں سے مل کر تو اتنی زیادہ اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا اجنبیت کا کہیں نام نہیں تھا۔ کشمالہ اور سائم سامنے رکھے فلور کشنز پر چڑھے بیٹھے مسلسل مسکرا رہے تھے' شاید اس کا آجانا انہیں خوشی فراہم کر رہا تھا۔

"بس یہ اسفی کو شوق ہے کہ میری بھتیجی ڈاکٹر بنے' ورنہ میں تو کہہ رہی تھی کہ گھر میں ایک ڈاکٹر کافی ہے۔" وہ گیتی آرا کی بات غور سے سن رہی تھی جب لاؤنج کا دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا تھا۔

"السلام علیکم!" نووارد نے سب پر سلامتی بھیجی تھی۔ وہ ان کی بات کا جواب دیتے دیتے بے اختیار چونک گئی تھی۔ اتنی مانوس آواز' سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو دل چاہا وہاں سے غائب ہو جائے۔

"اچھے وقت پر آئے اسفی اب لنچ گھر پر ہی کر کے جانا۔" گیتی آرا بولی تھیں۔ اسے دیکھ کر جو ایک لمحے کے لیے حیرت کا تاثر چہرے پر ابھرا تھا' اسفندیار نے اسے فوراً چھپا بھی لیا تھا۔ پہلا احساس شرمندگی اور ندامت کا تھا جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لیا تھا مگر دوسرے پل اسے کشمالہ اور سائم پر شدید ترین غصہ آیا تھا۔

"اگر یہ مذاق تھا تو انتہائی بے ہودہ۔" فلمی اور افسانوی قسم کے اتفاقات سے وہ سخت خار کھاتی تھی اور اب جب خود ایسی صورت حال سے گزرنا پڑ رہا تھا تو بس نہیں چل رہا تھا ان دونوں کا سر پھاڑ دے۔ وہ اضطراری انداز میں ہاتھ مسل رہی تھی جبکہ وہ اسے نظر انداز کر کے بی بی جان کی کسی بات کا جواب دینے لگا تھا۔

"آپ کھانا لگوائیں' مجھے ذرا اسٹڈی میں کچھ کام ہے' دس منٹ میں آتا ہوں۔" وہ گیتی آرا سے کہتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

"تم آرام سے بیٹھو' میں کھانا لگوا کر آتی ہوں۔" وہ اس کے پُرتکلف انداز میں بیٹھنے پر پیار سے ٹوکتے ہوئے اٹھی تھیں۔

"میں لنچ کے لیے ضرور رک جاتی مگر میری ڈیوٹی شروع ہونے والی ہے' یہ تو کشمالہ اچانک آگئی اور بضد ہوئی کہ

دس گھنٹوں بعد تمہیں ہوش آیا ہے۔" اس نے ایک دم ڈر کر ان کی گود سے سر اٹھایا تھا اور نظریں سیدھی سامنے کرسی پر بیٹھے تیمور پر پڑی تھیں۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے ساتھ کیا ہوا تھا سب ایک دم یاد آگیا تھا۔

"کیا ہوا ہانی!" اسے دوبارہ ہاتھ پاؤں چھوڑتا دیکھ کر وہ رو پڑی تھیں۔

"بابا! مجھے بچا لیں۔ بابا! آپ کہاں ہیں؟" بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے منہ سے نکلے سرگوشی نما یہ جملے ان دونوں ہی نے سن لیے تھے۔ اسے دوبارہ ہوش آیا تو پھپھو اکیلی اس کے بیٹھی تسبیح کے دانے گراتی مسلسل دعاؤں میں مصروف تھیں۔ ان کے ہاتھ سے ناشتہ کر کے وہ چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی۔ ان کے لاکھ پوچھنے پر بھی وہ ایک لفظ نہیں بولی تھی۔

"پتا نہیں مجھے کیا ہوا تھا۔ مجھے بالکل یاد نہیں۔" بہت دفعہ کے استفسار کے جواب میں وہ نظریں جھکا کر بولی تھی۔

وہ ظہر کی نماز پڑھنے ہی کے لیے اس کے پاس سے اٹھی تھیں ورنہ صبح سے یہیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ تیمور کو کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آتا دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں بالکل سن ہو گئے تھے۔ بے جان ہوتے جسم کے ساتھ وہ خود کو اس قابل بھی محسوس نہیں کر رہی تھی کہ اٹھ ہی سکے۔

"کیسی طبیعت ہے؟" وہ اس وقت وہی تیمور تھا جس کا لہجہ شیریں ہوتا تھا اور جس کی نظروں میں بڑا نرم و ملائم سا تاثر ہوتا تھا۔ اس کے چہرے کی سفید پڑتی رنگت دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے چپ سا ہو گیا تھا۔

"ہانیہ پلیز! جو ہوا اسے ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ میں اپنے رویے پر شرمندہ ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے ساتھ ایسا کبھی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بلیوی میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ تمہیں تکلیف دینے کا میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی بھی نہیں۔ کل رات جو کچھ ہوا، میں اس سب کے لیے معافی مانگ رہا ہوں۔" وہ ندامت سے سر جھکا کر بول رہا تھا۔

اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ دونوں میں سے کسے صحیح سمجھے، کل رات والے تیمور کو جو بے حد بے رحم تھا یا اسے جو چہرے پر افسردگی اور ندامت لیے بیٹھا تھا۔

وہ کچھ دیر تک اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا تھا اور پھر تھکے تھکے قدموں سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ کتنی دیر تک روتی رہی۔

شام تک اس کی طبیعت کافی سنبھل چکی تھی۔ اس کی چپ تو نہیں ٹوٹی تھی مگر طبیعت کافی بہتر تھی۔ پھپھو نے رات بھر کی ٹینشن کے بعد اس وقت سکون کا سانس لیا تھا۔ مگر جیسے جیسے رات ہونی شروع ہوئی اس کا خوف پھر عود آیا۔

"پھپھو! کہیں مت جائیں۔ میرے پاس بیٹھی رہیں۔" انہیں اٹھ کر جاتا دیکھ کر وہ خوف زدہ انداز میں بولی اور وہ اس کے متوحش انداز پر خوف زدہ بھی ہو گئیں۔

♥ ♡ ♡ ♥
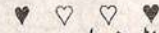
وہ لان چیئر پر بیٹھی غیر دلچسپی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ سردی کی شدت میں اچانک ہی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے کہنے پر پھپھو اسے یہاں بٹھا کر خود نہانے چلی گئی تھیں۔ تیمور کو اس طرف آتا دیکھ کر کل کی طرح وہ بے ہوش تو نہیں ہوئی تھی، خوف کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سے رنج اور ملال نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

اس کے چہرے پر نظر آتے دہشت اور بے اعتباری کے رنگ دیکھ کر وہ چپ سا ہو گیا تھا۔

"تیمور سجاد تمہیں کبھی بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ پلیز خود کو ریلیکس رکھو۔ دیکھو تمہاری وجہ سے آنٹی بھی کتنی پریشان ہیں۔" وہ آہستگی سے لیکن مضبوط لہجے میں بولا۔

"آپ کون ہیں؟" اس کی بات کو نظر انداز کر کے اس نے پوچھا۔

"یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟ دیکھیں مزید جھوٹ مت بولیے گا ہم سے۔" وہ بے اعتباری سے اس کی طرف دیکھ کر ہذیانی انداز میں بولی تھی۔

"دیکھو میں جو بھی ہوں اور جہاں سے بھی آیا ہوں مگر تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نرم لہجے میں بولا۔

"نقصان کا مطلب معلوم ہے آپ کو۔" وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر چلائی۔ "اگر معلوم ہوتا تو یہ بات کبھی نہ کہتے۔ کتنا بڑا نقصان ہوا ہے میرا، آپ کو اندازہ ہی نہیں۔ پھپھو نے آپ کو بیٹا بنایا، آپ پر اعتبار کیا اور آپ انہیں دھوکا دیتے رہے، ان کے بھروسے کا خون کرتے رہے۔ کیا وہ زندگی میں دوبارہ کسی پر بھروسہ کر پائیں گی۔ بتائیں جواب دیں۔ وہ ٹوٹ جائیں گی۔ کیا اس نقصان کا ازالہ ہو سکتا ہے اور میں؟ آپ نے جو بھی کیا ہو مگر میں آپ سے محبت کرنے لگی تھی۔ مجھے ایسا لگنے لگا تھا کہ ساری دنیا میں صرف یہی ایک شخص ہے جس پر میں آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتی ہوں۔ جس کے ساتھ ہونے پر میں اپنے سارے ڈر، سارے خوف بھول جاؤں گی۔" وہ روتے روتے گھاس پر دو زانو ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ "اور نقصان کسے کہتے ہیں۔ کیا اس سے بڑا بھی کوئی نقصان ہو سکتا ہے۔" وہ آنسو بہاتے ہوئے سرگوشیانہ بولی۔

"میں ہار گئی، میری محبت ہار گئی، پھپھو کا خلوص ہار گیا۔ نقصان تو ہو چکا۔" روتے روتے اس نے سر اٹھایا تو وہ پتا نہیں کب وہاں سے جا چکا تھا۔

پھپھو نے اسے رات میں نیند کی دوا کھلا کر سلا دیا تھا۔ اس کی کل کی خوف زدہ حالت کے پیش نظر انہوں نے ایسا ڈاکٹر کے مشورے پر کیا تھا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو پھپھو کمرے میں موجود نہیں تھیں۔ وہ انہیں آوازیں دیتی نیچے آئی تو وہ نماز کی چوکی پر بیٹھی قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر انہوں نے اشارے سے پاس بلایا اور اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ پھپھو کی آہستہ آواز میں کی جانے والی تلاوت۔ اس کے دل کو بڑا سکون پہنچا رہی تھی وہ تلاوت کر چکیں تو گل بی بی کو آواز دے کر بلایا۔

"انیکسی صاف کر کے سارے کمرے لاک کر دینا۔" اس کے ہاتھ میں چابیاں پکڑاتے ہوئے وہ افسردگی سے بولیں اس کی حیران شکل پر نظر پڑی تو بڑی اداسی سے بولیں۔

"تیمور چلا گیا ہے۔"

"چلے گئے؟" اس کے دل کو دھکا لگا تھا۔

"ہاں رات میرے پاس آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ کسی بزنس پرابلم کی وجہ سے اسے "فوراً" واپس جانا پڑے گا۔ صبح فجر سے بھی پہلے چلا گیا۔ اب تک دل کو یقین نہیں آ رہا کہ وہ چلا گیا ہے، کیسا اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا وہ۔" وہ اپنی آنکھوں کی نمی اس سے چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی تھیں۔

وہ چپ چاپ گم صم سی بیٹھی ہوئی تھی۔ پھپھو قرآن شریف ہاتھ میں لیے وہاں سے اٹھ گئیں تو وہ بھی بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی تھی۔ انیکسی کی طرف آتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہاں ویرانی ڈیرا جمائے بیٹھی تھی۔ دروازہ بند کر کے وہ بیڈ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے بستر کی چادر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے پتا نہیں کیا کیا یاد آ رہا تھا۔ آنسو ایک تواتر سے بہے چلے جا رہے تھے۔

"میں اس شخص کے لیے کبھی بھی نہیں روؤں گی۔ وہ جھوٹا تھا، قاتل تھا، اس نے ہمیں دھوکا دیا۔ ایسے آدمی کے لیے میں کبھی آنسو نہیں بہاؤں گی۔" وہ خود سے کہہ بھی رہی تھی اور روئے بھی جا رہی تھی۔ بک شیلف میں اس کی تمام کتابیں جوں کی توں موجود تھیں۔ اپنا باقی تمام سامان لے جانے کے باوجود وہ اپنی کتابیں یہیں چھوڑ گیا تھا۔

"لے لیجیے یہ گفٹ نہیں ہے۔ پڑھ کر مجھے "فوراً" واپس کر دیجیے گا۔" اسے لگا جیسے وہ کہیں پاس ہی کھڑا بول رہا ہے۔ وہ بک شیلف کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ سب سے اوپر والے خانے میں ترتیب سے

اس کے ساتھ گھر چلوں تو میں کھڑے کھڑے آپ لوگوں سے ملنے آ گئی تھی۔ تکلف کی کوئی بات نہیں۔ میں پھر آؤں گی۔"

وہ صوفے پر سے اٹھتے ہوئے فوراً بولی تھی۔ کشمالہ نے اس کے جھوٹ پر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی۔

"ارے ایسے کیسے، پہلی دفعہ آئی ہو، اس طرح بغیر کچھ کھائے میں تمہیں کبھی بھی نہیں جانے دوں گی۔" بی بی جان ناراض ہوئی تھیں۔

"تم تو ویسے بھی یہاں مہمان ہو اصولاً تو ہمیں تمہیں کشمالہ اور سائم سے بھی پہلے خود گھر پر انوائیٹ کرنا چاہیے تھا، حالانکہ ہماری نالج میں تھی یہ بات کہ نئی ڈاکٹر اپائنٹ ہوئی ہے مگر بس کوتاہی ہو گئی۔" گیتی آرا نے بھی اصرار کیا تھا۔

"آج تو آپ مجھے اجازت دے دیں، ڈیوٹی کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں ضرور رک جاتی پلیز۔" وہ ان لوگوں کے اصرار پر زچ ہوتے ہوئے بولی تھی۔

سائم اور کشمالہ خاموشی سے کھڑے ان لوگوں کی بات چیت سن رہے تھے، بی بی جان نے مزید اصرار نہیں کیا تھا مگر انہوں نے گیتی آرا کو کچھ اشارہ ضرور کیا تھا جو اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔

"چلو جیسی تمہاری مرضی۔" ان کے کہنے پر اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ وہ لاؤنج کے دروازے سے نکل رہی تھی جب گیتی آرا واپس آئی تھیں، ہاتھ میں ایک ڈبا تھا جو انہوں نے جلدی سے بی بی جان کو پکڑایا تھا۔

"یہ لو، ہماری طرف سے چھوٹا سا تحفہ۔" بی بی جان نے ڈبا اس کی طرف بڑھایا، وہ یہاں سے کوئی بھی تحفہ وصول نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اس جگہ اس کا انکار بالکل کام نہیں آیا تھا، اس کے زیادہ منع کرنے پر جب وہ باقاعدہ ناراض ہونے لگیں تو مجبوراً اس نے وہ ان کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ وہ دونوں خواتین بہت خوش اخلاق اور مہمان نواز تھیں مگر وہ پھر بھی یہاں مزید ایک لمحہ بھی نہیں رکنا چاہتی تھی، سائم اور کشمالہ اس کے ساتھ ہی باہر نکلے تھے۔ ان لوگوں کو آتا دیکھ کر ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

سائم اور کشمالہ بھی بیٹھ گئے تو ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ اس کے چہرے کے ناراضی بھرے تاثرات دونوں کو کچھ بھی کہنے نہیں دے رہے تھے۔ انہیں اندازہ تھا وہ ان سے بری طرح ناراض ہو گئی تھی۔ ڈرائیور کی موجودگی کے سبب ان دونوں ہی نے خاموشی اختیار کیے رکھی تھی گو کہ گاہے گاہے اس کے تاثرات کا جائزہ بھی لیا جا رہا تھا۔ گاڑی ہاسپٹل کے گیٹ کے سامنے رکی تو وہ دونوں بھی اس کے ساتھ ہی اتر آئے تھے۔

"زوبیہ آپی آپ۔" کشمالہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا مگر وہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سخت لہجے میں بولی تھی۔

"تم لوگ مذاق کرتے ہو، بہت اچھا لگتا ہے، میں تم لوگوں کے مذاق کو انجوائے بھی کرتی ہوں، مگر کشمالہ! مذاق اور بدتمیزی میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ آج جو تم لوگوں نے کیا وہ مذاق نہیں بدتمیزی تھی اور تم لوگوں کی یہ بدتمیزی میں معاف نہیں کر سکتی۔" اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ گیٹ میں گھس گئی تھی۔

"پلیز زوبیہ آپی، ہماری بات تو سنیں، دیکھیں سچ ہمارا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا، پلیز رک کر بات تو سن لیں۔" سائم اس کے پیچھے اندر آتا ہوا ملتجی لہجے میں بولا تھا۔

"میرا اور ڈاکٹر اسفندیار کا تعلق مالک اور ملازم کا ہے۔ تم لوگوں کی اس حرکت کی وجہ سے ان کی نظروں میں میری کیا عزت رہ گئی ہوگی، شاید وہ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں جاب میں مزید فائدے، آسانیاں اور مراعات حاصل کرنے کے لیے ان کی فیملی سے جان بوجھ کر تعلقات استوار کرنے کی کوشش کر رہی ہوں، بجائے اپنے کام اور اپنی صلاحیتوں کے بل پر خود کو منوانے کے میں اتنی چیپ اور تھرڈ کلاس حرکتیں کر رہی ہوں کہ ان کے گھر تک پہنچ گئی۔ This is too much saim، میں اتنی انسلٹ برداشت نہیں کر سکتی۔"

وہ سخت انداز میں بولتی فوراً ہاسٹل کی طرف چلی گئی تھی۔ کمرے میں آنے کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ خود پر بھی شدید تاؤ آ رہا تھا آخر اسے ان دونوں کی باتوں میں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ان کا دیا خوب صورت شیشوں کے

ورک والا سرخ جوڑا اس نے بے دلی سے الماری میں رکھ دیا تھا، اول تو وہ شوخ رنگ پہنتی ہی نہیں تھی، اس کے پاس زیادہ تر تمام جوڑے سفید، آف وائٹ، گرے، لائٹ براؤن اور اسی طرح کے ہلکے پھلکے رنگوں کے سادہ پرنٹ والے کاٹن کے سوٹ تھے۔ عرصہ ہوا اس نے خود پر توجہ دینا آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا تھا، کئی سالوں سے لپ اسٹک نے اس کے ہونٹوں کو نہیں چھوا تھا، آنکھیں کاجل سے نہیں سجی تھیں، منہ دھویا، بالوں کو فولڈ کر کے بینڈ لگایا، کپڑے بدلے اور تیاری مکمل۔ لیکن اگر وہ ایسے رنگ پہنتی بھی ہوتی تب بھی یہ کپڑے تو شاید کبھی نہ پہنتی۔ "ابھی تو میں ان کے سامنے خود کو ایک اچھی ڈاکٹر اور سو فیصد پروفیشنل اپروچ رکھنے والی لڑکی ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ان دونوں کے فضول مذاق نے سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔" وہ ٹانگ جتنے بچے کتنی آسانی سے اسے الو بنا گئے تھے، اسے ابھی اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کے بھتیجا بھتیجی ہیں۔

رات میں اس کا اسفندیار سے سامنا ہوا تو وہ ڈرتی ہی رہی کہ کہیں وہ کچھ کہہ نہ دے، کوئی طنزیہ بات، ان ڈائریکٹ کسی اور پر رکھ کر ہی کوئی بات نہ کہہ دے، مگر وہ کچھ نہیں بولا تھا، وہی روٹین کا انداز تھا اس کا۔ اسفندیار نے اس بات کو نظرانداز کر دیا تھا مگر اسے جو شرمندگی ہوئی تھی وہ اپنی جگہ برقرار تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اگلے روز کشمالہ کو ہاسپٹل میں دیکھ کر اس نے سوائے سلام کا جواب دینے کے کوئی بات نہیں کی تھی، وہ اپنے سامنے بیٹھی مریضہ کا بی پی چیک کر رہی تھی۔ کشمالہ کرسی پر بیٹھ کر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی تھی، دوا کی پرچی اس کے ہاتھ میں پکڑا کر وہ نرس سے دوسری مریضہ کو بلانے کا کہتی بی پی اپریٹس سائڈ میں رکھنے لگی تھی۔

"آپ ہم لوگوں سے ناراض ہو گئیں اور اب کوئی بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں۔ بات تو بس اتنی سی ہے کہ شروع میں واقعی ہم لوگوں نے آپ کو جان کر لالہ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ آپ ان کے بارے میں جو کمنٹس دیتیں، ہم لوگ اسے انجوائے کرتے تھے۔ بس اتنی سی بات تھی۔ مگر کل ہمارا مقصد آپ کو لالہ کے سامنے شرمندہ کروانا نہیں تھا، وہ صبح گھر سے چلے جائیں تو اس وقت گھر کبھی واپس نہیں آتے، ہمارا دل چاہ رہا تھا کہ آپ ہمارے گھر آئیں، پھر ہم وہیں آپ کو اپنے اور لالہ کے تعلق کے بارے میں بھی بتانا چاہتے تھے مگر بالکل اچانک قطعاً "غیر متوقع انداز میں لالہ اس وقت گھر آ گئے، اور آپ پتا نہیں کیوں اتنی کونشیس ہو رہی ہیں، لالہ کو ہماری اور آپ کی دوستی پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور پھر وہ اتنے تنگ نظر بھی نہیں ہیں کہ آپ کو یہاں دیکھ کر کوئی الٹی سیدھی بات انہوں نے سوچی ہوگی۔ یقین کریں، وہ بہت جینئس اور غیر معمولی ذہین آدمی ہیں، اب تک کیا انہیں آپ کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہوا ہو گا جو وہ کچھ فضول سوچیں۔"

دوسری مریضہ کے اندر آنے تک وہ جلدی جلدی وضاحت کرنے میں مصروف تھی۔

"بیٹھیے۔" اس کی بات کا جواب دیے بغیر وہ اندر آنے والی مریضہ سے مخاطب ہو چکی تھی، وہ گود میں لیے بچے کی بیماری کے بارے میں اسے بتا رہی تھی "پیٹ خراب ہے، الٹیاں آ رہی ہیں۔" وہ اس کی ساری بات سننے کے بعد دوا کے ساتھ ساتھ اسے او آر ایس کا طریقہ استعمال بتاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"جسم میں پانی کی کمی ہو گئی ہے، تھوڑی تھوڑی دیر بعد او آر ایس دیں۔"

اسے جواب دیتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے کشمالہ کی طرف دیکھا جو اس کے رویے سے مایوس ہو کر اٹھ گئی تھی۔

"کشمالہ! میں تم لوگوں سے ناراض نہیں ہوں۔" وہ ایک دم واپس مڑی۔ چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"واقعی!"

"ہاں، لیکن اب تم جاؤ، دیکھو اس وقت مریضوں کا رش لگا ہے۔"

وہ خوشی خوشی گردن ہلاتی باہر نکل گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥
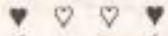
"آپ نے بچوں کی عادتیں خراب کر دی ہیں، وہ بیڈ نمبر سات پر جو بچہ ایڈمٹ ہے، سسٹر سے انجکشن لگوانے کے لیے تیار ہی نہیں، ایک ہی رٹ ہے کہ ڈاکٹر زوبیہ سے

لگواؤں گا۔" ڈاکٹر تاجدار نے اسے مخاطب کیا جو فی الحال فارغ بیٹھی تھی۔

"جو اچھا انسان نہ ہو' وہ اچھا ڈاکٹر کیسے ہو سکتا ہے۔" ڈاکٹر شنور نے ایک روز باتوں باتوں میں یہ بات کہی تھی اور ان کی یہ بات اس نے گرہ سے باندھ لی تھی۔ اگر ڈاکٹر خوش اخلاق ہو' مہربانی' ہمدردی اور محبت کے جذبوں سے بھرپور ہو تو مریض کی آدھی بیماری تو اس کی باتوں ہی سے رفع ہو جاتی ہے اور وہ اسی چیز پر عمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پہلی مرتبہ یہ کوشش اس نے گل خان کے ساتھ کی تھی' ٹانگ کٹ جانے پر جو زندگی سے ہی بیزار ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں اسے ناکامی ہوئی تھی مگر کب تک' وہ بچہ آخر کار اس کی بات سننے پر آمادہ ہو ہی گیا تھا۔ اس نے تب ڈاکٹر تاجدار سے بچوں کی بہت سی اسٹوری بکس' چاکلیٹ اور ٹافیاں وغیرہ منگوائی تھیں اور اسے باتیں کر کے' کہانیاں سنا کر بہلانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی کوششوں کے نتیجے میں اس کی مایوسی میں کافی کمی آئی تھی۔

اسے ڈاکٹر آصفہ سے مصنوعی ٹانگ کے بارے میں بات کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی' ان لوگوں کا پہلے ہی سے ایسا کرنے کا ارادہ تھا۔ بہت سارے دن ہاسپٹل میں رہ کر جب وہ ڈسچارج ہوا تو اس سے گہری دوستی کر چکا تھا۔ اس کے ماں باپ اس کے بہت شکر گزار تھے' جانے سے پہلے اس کی ماں نے اسے اپنے ہاتھوں سے کاڑھا ہوا دوپٹہ بطور تحفہ پیش کیا تو اس کا دل نہ ٹوٹ جائے یہ سوچ کر اس نے لے لیا تھا' پھر اس کے بعد اس نے بچوں کے ساتھ خاص طور پر کی کرنا شروع کر دیا تھا۔

بچے سسٹر رضیہ کو پسند نہیں کرتے تھے' ڈاکٹر تاجدار کا سخت لب و لہجہ بھی انہیں ناگوار گزرتا تھا مگر زوبیہ ان سب کی پسندیدہ تھی۔ وہ انہیں چاکلیٹس دیتی تھی' مزے مزے کی باتیں کرتی تھی اور وہ جوابا" خاموشی سے دوا کھا لیتے' انجیکشن لگوا لیتے' ڈرپ چڑھوا لیتے۔

وہ وارڈ میں داخل ہوئی تو کونے والے بیڈ پر لیٹے بچے کے پاس ڈاکٹر شنور اور ڈاکٹر اسفندیار دونوں کھڑے تھے۔ اس کا تفصیلی معائنہ کرتے ہوئے وہ دونوں آہستہ آواز میں آپس میں کچھ ڈسکس بھی کر رہے تھے۔ دونوں کو ایک ساتھ کھڑا دیکھ کر اسے بچے کی بہت زیادہ سیریس حالت کا اندازہ ہوا۔ اس کا باپ بے چارہ دھکے کھاتا پتا نہیں کس طرح اپنے بچے کو یہاں پر لانے میں کامیاب ہوا تھا' وہ کسی اور گاؤں کا رہنے والا تھا اور موسم کی خرابی کی وجہ سے آمد و رفت کے ذرائع ان دنوں بری طرح متاثر تھے۔ صبح ہی وہ بچہ ایڈمٹ کیا گیا تھا' چیک اپ کے بعد ان دونوں نے آپس میں سنجیدہ نگاہوں کا تبادلہ کیا تھا' وہ بیڈ نمبر سات کے بچے کو پیار سے انجکشن لگاتے ہوئے ان لوگوں کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس نے بغیر چوں و چرا فورا" انجکشن لگوا لیا تھا۔ وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے تو وہ سرزنش کرنے والے انداز میں بچے سے بولی۔

"اگر میں نہیں ہوں گی تو انجکشن نہیں لگواؤ گے' یہ تو بہت بری بات ہے۔" بچے نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا تھا۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے اس نے اس کونے والے بچے پر ایک ترحم بھری نظر ڈالی اور باہر نکل آئی۔

"بہت لیٹ ہو گیا' اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" کوریڈور میں چلتے ہوئے ڈاکٹر شنور مایوس لہجے میں اسفندیار سے بولے تھے۔ وہ جوابا" کچھ بولا تھا جو اسے سنائی نہیں دیا تھا' اس کا دل ایک دم بجھ سا گیا تھا' جب بھی وہ کسی کو زندگی ہارتا دیکھتی اس پر ایسی ہی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر آصفہ سے ایک بار اس نے اپنی پرابلم ڈسکس کی تو انہوں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا تھا۔

"ابھی آپ نئی ہیں' کیریر کی شروعات ہے اس لیے اتنا زیادہ حساس ہو کر سوچتی ہیں۔ آہستہ آہستہ عادی ہو جائیں گی۔ یہ تو ہمارے پروفیشن کا حصہ ہے۔ کبھی زندگی اور کبھی موت' ہمیں خود کو ہر بات کے لیے تیار رکھنا چاہیے۔ ہم اپنے ہر مریض کی جان بچانا چاہتے ہیں مگر اللہ کی مصلحت کے سامنے تو ہماری تمام کوششیں بے معنی ہیں۔ جس کا وقت آگیا' اسے ہم کیسے بچا سکتے ہیں۔"

♥ ♡ ♡ ♥

کافی دن ہو گئے تھے' خجستہ کی کوئی خیر خبر نہیں تھی' وہ اس کے گھر جانے کا فیصلہ کر کے اس کے دیور شہباز کے پاس چلی آئی۔ وہ اس کی بات سن کر حیران ہوتا ہوا اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ خجستہ تو اسے دیکھ کر خوش ہوئی ہی تھی مگر اس کی ساس بھی ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ آخر کو ڈاکٹرنی ان کے گھر خود چل کر آئی تھی' کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

"اتنی پرانی کھانسی ہے' ٹھیک ہی نہیں ہوتی۔" وہ اسے دیکھتے ہی بیماریاں سنانی شروع ہو گئی تھی۔

"میں دوائی بھجوا دوں گی آپ کے بیٹے کے ہاتھ۔ انشاء اللہ کھانسی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے اس کی تمام شکایات سننے کے بعد تسلی دی تھی۔ حالانکہ اس کی ساس کی شکل دیکھ دیکھ کر اس کا بلڈ پریشر بڑھ رہا تھا مگر وہ ضبط سے کام لے رہی تھی۔ جلدی جلدی قہوے سے اس کی تواضع کی گئی تھی۔ خجستہ اسے دیکھ کر بس صرف مسکرائے جا رہی تھی' اکیلے میں بات چیت کا موقع تو نہیں مل سکا تھا مگر اس کی ساس سے جو خوشگوار تعلقات استوار ہوئے تھے ان کی بدولت اسے تسلی تھی کہ وہ آئندہ جب چاہے خجستہ سے ملنے آجایا کرے گی۔ ہاسپٹل جاتے ہی اس نے شہباز کو دوا کی شیشی دی تھی۔

"اپنی اماں سے کہنا جیسے میں نے کہا تھا ویسے ہی دوا پئیں۔ کل پھر مجھے بتانا' کچھ فائدہ ہوا کہ نہیں۔"

وہ سر ہلاتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥
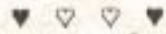
رمضان شروع ہو گئے تھے' وہ خالہ امی کے گھر گزاری عید اور رمضان یاد کر کے تھوڑی سی افسردہ ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر آصفہ عید کی شاپنگ کے لیے شہر جا رہی تھیں' اسے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی تو اس نے سہولت سے منع کر دیا تھا۔

"کافی سارے نئے جوڑے بغیر پہنے ایسے ہی رکھے ہیں۔"

"تم مجھے کوئی سو سال پرانی بھٹکی ہوئی روح معلوم ہوتی ہو۔ نہ کپڑوں کا شوق نہ جیولری نہ میک اپ۔ شادی وادی کرنے کا ارادہ ہے یا نہیں۔ ایسے تو مشکل ہی سے کوئی پسند کرے گا۔" وہ بھی کبھار بے تکلف ہو کر اسی طرح ہلکی پھلکی باتیں شروع کر دیا کرتی تھیں۔

"کیا پتا کوئی پسند کر ہی لے' بھٹکے ہوؤں کی کمی تھوڑی ہے دنیا میں۔" اس نے انہیں تسلی دیتے ہوئے اپنے سامنے رکھا پروفیشنل جرنل کھول لیا تھا۔

مختلف جرنلز میں ڈاکٹر شنور' ڈاکٹر آصفہ اور اسفندیار کے ریسرچ پیپرز اور آرٹیکلز پبلش ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر شنور تو کئی جرنلز کے ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبر بھی تھے۔ وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر خود ہی شاپنگ کرنے چلی گئی تھیں۔ وہاں سے لوٹیں تو اس کے لیے بھی ایک سوٹ لائی تھیں۔

"یہ میری طرف سے عیدی سمجھ لو' عید پر میں سارے اسٹاف کو عیدی دیتی ہوں' تمہیں پیسوں کی جگہ سوٹ دے رہی ہوں۔"

انہوں نے پیسے لینے سے صاف انکار کرتے ہوئے تاویل پیش کی تو اسے خاموش ہو جانا پڑا تھا۔

رمضان شروع ہونے سے پہلے ہی وہ کافی لوگوں سے سن چکی تھی کہ رمضان میں ایک دن اسفندیار سب کو افطار ڈنر دیتا ہے۔ سال بھر میں اس کی طرف سے سارے اسٹاف کے لیے یہ ایک دعوت ہوتی ہے' وہ بھی اس کے اپنے گھر پر اور عید کے پہلے یا دوسرے دن ڈاکٹر آصفہ اور ڈاکٹر شنور سب لوگوں کو اپنے گھر لنچ یا ڈنر کرواتے ہیں۔

"سنڈے کو تو اسفند کے گھر جانا ہے' افطار پارٹی میں۔" ڈاکٹر آصفہ کسی بات کے دوران یہ بات اس طرح بولیں جیسے وہ پہلے سے اس بات سے آگاہ تھی' حالانکہ اس کے فرشتوں کو بھی اس بات کی خبر نہیں تھی۔

نائٹ ڈیوٹی کی وجہ سے وہ ڈاکٹر شہاب اور سسٹر رضیہ ہاسپٹل میں ہی سحری کر رہے تھے جب شہاب سسٹر رضیہ سے بولا۔

"پرسوں افطار پارٹی ہے ڈاکٹر اسفندیار کے ہاں' مجھ سے کہہ رہے تھے کہ ویسے تو وہ خود سب کو انوائیٹ کریں گے مگر پھر بھی کہیں کوئی رہ نہ جائے' اس لیے احتیاطا" میں بھی سب سے کہہ دوں۔"

"ہاں' مجھے ڈاکٹر تاجدار نے دوپہر میں بتایا تھا' اس دن کا تو سب کو ہی انتظار ہوتا ہے' اسی ایک دن تو ڈاکٹر اسفندیار سب سے دوستانہ انداز میں ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ بلکہ بقول ڈاکٹر تاجدار اس روز ان کی ہنسی کے دروازے عوام الناس کے لیے کھول دیے جاتے ہیں۔" سسٹر رضیہ نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے خوش دلی سے بولی تھیں۔

وہ چپ چاپ بیٹھی ان لوگوں کی باتیں سن رہی تھی' وہ لوگ پچھلے سال کی پارٹی کو یاد کر کے مختلف باتوں پر ہنس رہے تھے۔

اگلے روز اس کی دن بھر میں کافی دفعہ اسفندیار سے مڈبھیڑ ہوئی تھی' بچوں کے وارڈ میں' کوریڈور میں اور خود وہ اس کے کمرے میں دو دفعہ مختلف کاموں کے سلسلے میں گئی

تھی مگر اس نے اسے ایک بار بھی انوائیٹ نہیں کیا تھا۔
اسے بہت زیادہ انسلٹ محسوس ہوئی تھی۔ وہ ٹیکنیشنز میں سے نرسوں میں سے 'وارڈ بوائز' صفائی کرنے والے عملے 'بلڈ بینک میں موجود لوگ' فارمیسی میں بیٹھے لوگوں میں سے کسی کو ذاتی طور پر کہنا بھول جاتا تو برا ماننے والی بات نہیں تھی کیونکہ وہ سب اتنی زیادہ تعداد میں تھے کہ بھول چوک ہو سکتی تھی مگر ڈاکٹرز تو یہاں صرف چھ ہی تھے اور ان میں خواتین تو محض دو۔ ایسے میں یہ بات مانی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ اسے بھولا جا سکتا ہے۔ اس نے سوچا ہو گا کہ جو لڑکی میرے بھتیجا' بھتیجی سے دوستی گانٹھ کر بن بلائے میرے گھر آ سکتی ہے اسے اسپیشلی اپنے منہ سے بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ ظاہری بات ہے وہ تو آ ہی جائے گی' بلکہ دن گن گن کر اس ڈنر کا انتظار کر رہی ہو گی۔

ہفتے والے دن انیکسی میں اکیلے بیٹھ کر افطار کرتے ہوئے اس نے بہت جل کر سوچا تھا۔ وہ دوپہر میں ہی ڈاکٹر شنور سے بیماری کا بہانا کر کے ہاف ڈے لے کر آ گئی تھی۔ میزبان کو تو اس کے آنے نہ آنے سے کوئی سروکار نہ تھا مگر باقی لوگوں کے سوالوں کے جواب تو بہرحال دینے تھے اور اسے بلاوجہ اپنی ذات کو موضوع بحث بنایا جانا پسند نہیں تھا۔ اس لیے بیماری کا بہانا سب سے معقول نظر آیا تھا۔
مغرب کی نماز پڑھ کر بیٹھی تو بھی ذہن وہیں افطار ڈنر میں الجھا ہوا تھا۔ وہ اسے خاص طور پر کیوں انوائیٹ کرتا۔ وہ نہ تو ڈاکٹر شنور اور ڈاکٹر آصفہ کی طرح بے لوث خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر یہاں مفت خدمات انجام دے رہی تھی نہ ان کی طرح اس نے اپنے ذاتی خرچے پر آپریشن تھیٹر اور لیبارٹری کے لیے مختلف مشینیں مہیا کی تھیں۔
وہ ڈاکٹر تاجدار کی طرح کسی مل اونر کی بیٹی بھی نہیں تھی جو جسٹ فار آ چینج سمجھ کر یہاں کام کر رہا تھا' وہ ڈاکٹر شہاب کی طرح شوقیہ ملازمت بھی نہیں کر رہی تھی جس کے پاس اپنی اتنی زمین' جائیداد تھی کہ کسی نوکری کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ وہ تو بے ماں باپ کی کسی خالہ کے گھر پلی ہوئی ایک غریب ڈاکٹر تھی' جس نے یہاں نوکری بھی تنخواہ میں ملنے والی لمبی چوڑی رقم سے متاثر ہو کر کی تھی پھر آخر اس جیسے امیر کبیر جاگیردار کو کیا ضرورت تھی اسے غیر ضروری اہمیت دینے کی۔ اس پر خود ترسی پوری طرح حاوی ہو چکی تھی۔
کھانا کھائے بغیر وہ عشاء کی نماز اور تراویح پڑھ کر سونے لیٹی تو کتنے آنسو چپ چاپ نکل آئے تھے۔
"کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟" اگلے روز وہ ڈاکٹر شنور کے کمرے میں آئی تو وہاں اسفندیار بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اسفندیار نے تو صرف سلام کا جواب دینے پر اکتفا کیا تھا مگر ڈاکٹر شنور نے جواب دیتے ہی فوراً اس کی خیریت دریافت کی تھی۔
"کافی بہتر ہے بخار تو اتر گیا' بس تھوڑی کھانسی اور نزلہ ہے۔"
نزلہ کھانسی تو ویسے ہی تین دن سے اسے جکڑے ہوئے تھے۔ اس لیے جھوٹ بڑے آرام سے نبھ گیا تھا۔
اسفندیار ایک نظر اس کے چہرے پر ڈال کر سامنے رکھی فائل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا اسے اس گفتگو میں کوئی خاص دلچسپی نہیں۔
"ایک دو دن اور ریسٹ کر لیتیں' ویسے ہی اتنی دھان پان سی ہیں کہیں لمبی نہ پڑ جائیں۔" انہوں نے پر تشویش انداز میں کہا تھا۔
"سارک ممالک کے ڈاکٹرز کی کانفرنس ہو رہی ہے کولمبو میں' میرا اور آپ کا دونوں کا بلاوا آیا ہے۔" وہ فائل پر سے سر اٹھائے بغیر ان سے مخاطب ہوا تھا۔
"اچھا بنیادی ایشو کیا ہے کانفرنس کا؟" وہ بھی اسے چھوڑ کر اس کی بات میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔
"وہی تیسری دنیا کے ممالک میں عوام کو علاج کی بہتر سہولتیں کس طرح مہیا کی جا سکتی ہیں' شرح اموات کس طرح گھٹائی جائے اور لوگوں میں حفظان صحت کے اصولوں کے بارے میں شعور کیسے بیدار کیا جائے۔" وہ بیزاری سے بولا تھا۔ وہ جو پیپرز انہیں دینے آئی تھی' وہ ٹیبل پر رکھتے ہوئے خاموشی سے پلٹ گئی تھی۔
"بس باتیں کروا لو ان لوگوں سے جیسے دنیا کے تمام مسائل باتیں کرنے سے ہی حل ہو جائیں گے۔" کمرے سے نکلتے ہوئے اسفندیار کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ کل بیدار ہوا غیر اہم ہونے کا احساس اس وقت مزید بڑھ گیا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر توقع کر رہی تھی کہ وہ اس سے کل نہ آنے کا سبب ضرور دریافت کرے گا

اور اس نے سوچا ہوا بھی تھا کہ اگر اس نے پوچھا تو وہ صاف صاف اس کے منہ پر کہہ دے گی کہ بن بلائے جانے کی اسے کوئی خواہش نہیں تھی مگر اس کی تمام سوچوں پر پانی پھر چکا تھا۔ کل پیدا ہوئی خود ترسی آج توہین اور ڈپریشن کا روپ دھار چکی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

عید والے دن ڈاکٹر آصفہ اور ڈاکٹر شنور نے اسے خاص طور پر سارا دن اپنے گھر گزارنے کی دعوت دی تھی مگر جب صبح عید کی نماز کے بعد ہی گل خان اپنے باپ کے ساتھ اس سے عید ملنے آیا اور پھر اپنے گھر چلنے پر اصرار کرنے لگا تو وہ بلا تکلف ان لوگوں کے ساتھ چلی گئی تھی۔
ان کے چھوٹے سے بوسیدہ مکان میں بیٹھ کر گل خان کی بے بے کے ہاتھوں کے پکائے کھانے اس نے بہت مزے لے لے کر اور خوب پیٹ بھر کر کھائے تھے۔
گل خان کو عید پر دینے کے لیے اس نے خاص طور پر ڈاکٹر تاجدار سے رمضان شروع ہونے سے بھی پہلے ہی ایک جوڑا منگوایا ہوا تھا مگر اب جو ان کے گھر آئی تو اس کے باقی بہن بھائیوں کو بھی عیدی دی تھی اور ایسا کر کے اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا وہ کہیں غیروں میں ہے' ان لوگوں کا خلوص اور محبت اسے ہر گھڑی یہی احساس دلا رہی تھی کہ وہ اپنوں کے درمیان ہے۔
کافی سارا وقت وہاں گزار کر وہ وہیں سے خجستہ کے گھر آ گئی تھی۔ جب سے اس کے علاج سے اس کی ساس کی دائمی کھانسی میں افاقہ ہوا تھا وہ اس سے بہت خوش تھی' سو اس روز بھی اسے دیکھ کر گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسے دیکھ کر تو بہادر بھی بہت محتاط اور باادب ہو جاتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے چپکے سے خجستہ کے ہاتھ میں ہزار روپے کا نوٹ تھمایا تھا۔ وہ لیتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔
"میں بڑی ہوں تم سے' تمہارا حق ہے مجھ سے لینے کا اور ہاں یہ پیسے اپنی ساس اور شوہر سے چھپا کر رکھنا۔ کبھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو تمہارے پاس پیسے تو ہونے چاہئیں۔" اس نے بڑی بہنوں والے رعب سے اسے سمجھایا تھا۔
رات میں اس کی ڈیوٹی تھی۔ ایسے میں اسے ڈاکٹر آصفہ کے ہاں جانے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ گرچہ خیال بھی تھا کہ کہیں وہ اس کے نہ آنے کا برا نہ مان گئی ہوں۔ آخر وہ بے چاری اس کی تنہائی کے خیال سے ہی اسے بلا رہی تھیں' عید کے دوسرے دن ان کے ہاں ڈنر تھا' اس نے سوچا صبح ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہی ان کے گھر چلی جائے گی۔

♥ ♡ ♡ ♥
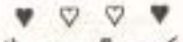
دن کے گیارہ بج رہے تھے جب وہ ہاسٹل سے چوکیدار کو ساتھ لے کر ان لوگوں کے گھر آ گئی تھی۔ حالانکہ ان کا گھر ہاسٹل سے بہت قریب تھا مگر پھر بھی وہ آج یہاں پہلی مرتبہ آئی تھی۔ کافی دفعہ وہ اس بات پر شکوہ بھی کر چکی تھیں' شام میں پہننے کے لیے وہ شاپر میں رکھ کر ان ہی کا دیا ہوا سوٹ لائی تھی۔ کتنے پیار اور خلوص سے ان دونوں نے اسے آج کے ڈنر کے لیے انویٹیشن دیا تھا' ڈاکٹر شنور خاص طور پر خود اس کے پاس آ کر دعوت دے کر گئے تھے
"ضروری تو نہیں کہ ہر پڑھا لکھا' قابل' جینئس اور امیر آدمی بد دماغ اور مغرور بھی ہو۔" ان کے اس طرح پر خلوص انداز میں بلانے پر اس نے بے اختیار سوچا تھا۔
گیٹ پر بیل دینے کے ساتھ اس نے چوکیدار کو واپس جانے کا اشارہ کر دیا تھا اور خود خاموشی سے گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگی تھی۔ گیٹ کھلنے پر جو شخصیت اسے نظر آئی' اس کی موجودگی کی وہ یہاں توقع نہیں کر رہی تھی۔ اسے اتنے استحقاق سے گیٹ کھولتے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے چکرا گئی تھی۔
"السلام علیکم۔" اس کی ہونق شکل پر سنجیدہ نظریں ڈالتے ہوئے اس نے خود ہی سلام کر دیا تو کچھ گڑبڑا کر تھوک نگلتے ہوئے اس کے منہ سے "وعلیکم السلام" نکلا تھا۔
"دعوت تو شام میں ہے۔" وہ بہت سنجیدگی اور بردباری سے بولا تھا۔ گیٹ کے سامنے پھیل کر کھڑے ہوئے وہ اسے یہ اطلاع فراہم کر رہا تھا اور اس کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا تھا' اس کے چہرے پر سنجیدگی مگر آنکھوں میں طنزیہ سی چمک تو وہ با آسانی دیکھ سکتی تھی۔ دل تو اس کا یہ چاہا کہ بغیر کچھ بولے واپس پلٹ جائے مگر دماغ نے فوراً دل کو ڈپٹ کر عقل دلائی تھی۔
"یہ اس کا گھر نہیں جو مجھے کسی شرمندگی کا احساس ہو' یہاں کے مکینوں نے بعد اصرار مجھے اپنے گھر بلایا ہے اور

ایک بار نہیں کئی بار بلایا ہے۔"

"مجھے پتا ہے۔" دماغ کے سمجھانے کی دیر تھی' وہ اس کی طنزیہ نظروں میں براہ راست دیکھتے ہوئے اعتماد سے بولی تھی اور وہ جواباً "پتا نہیں کیوں' مسکرایا تھا' صحیح کہہ رہی تھیں مسز رضیہ موصوف عید کے عید مسکراتے ہیں مگر ہوتی یہ مسکراہٹ بھی طنزیہ ہے۔

"کون ہے اسفند؟" اندر کہیں سے ڈاکٹر شہنور کی آواز آئی تھی اور وہ ایک دم گیٹ کے سامنے سے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دے گیا تھا۔

"تایا! آج تو بڑے بڑے لوگ ہمارے گھر آئے ہیں۔" ڈاکٹر شہنور شطرنج کی بساط بچھائے بیٹھے تھے اسے دیکھتے ہی سب چھوڑ چھاڑ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"آصفہ! دیکھو تو کون آیا ہے۔" اسے سلام کا جواب دیتے ہی انہوں نے باآواز بلند ڈاکٹر آصفہ کو آواز دی۔ وہ شاید کچن میں تھیں' ایپرن پہنے' دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی فوراً" دروازہ کھول کر لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں۔

"ارے زوبیہ!" انہوں نے آگے بڑھ کر پرجوش انداز میں اسے گلے سے لگایا "کل کتنا انتظار کیا ہم لوگوں نے تمہارا۔"

صوفے پر اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے انہوں نے شکوہ کیا تو اس نے ایک نظر سامنے صوفے پر بیٹھے اسفندیار پر ڈالی۔ وہ بساط پر نظریں جمائے چال سوچ رہا تھا۔ ڈاکٹر شہنور البتہ فی الحال شطرنج سے نظریں ہٹا کر اسی کی طرف متوجہ تھے۔

"کل میں گل خان کے ساتھ چلی گئی تھی۔" اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا تھا۔

"اچھا تم بیٹھو' میں ابھی دو منٹ میں آتی ہوں۔ چولہے پر پیاز رکھی ہے۔ کہیں جل نہ جائے۔" وہ ناک سکیڑ کر پیاز کی خوشبو سونگھتے ہوئے بولیں تو وہ بھی ان کے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔" کچن میں پھیلا سامان بتا رہا تھا کہ دعوت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ایک ملازمہ تو ان کی اپنی تھی اور ایک ان کی مدد کرانے کے لیے اسفندیار کے گھر سے آئی ہوئی تھی۔

"میں آپ کی کچھ ہیلپ کروں۔" ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر کچن میں بیٹھے اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ کام کرتے ہوئے مسلسل اس سے باتیں کر رہی تھیں' اس دوران کولڈ ڈرنک سے اس کی تواضع بھی کی جا چکی تھی۔ انہوں نے تکلفاً "منع کرنا چاہا تو وہ ناراضی سے بولی۔

"اتنی پھوہڑ نہیں ہوں میں' یقین کریں۔"

جواباً" وہ ہنس پڑی تھیں۔ "تم بادام کا قورمہ بنا لو گی؟" انہوں نے فریزر سے گوشت کا پیکٹ نکالتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"آپ کو میری صلاحیتوں پر بہت شبہ ہے۔ میرے ہاتھ کے پکے قورمے کی تو دور دور تک دھوم ہے۔ جو کھائے انگلیاں چاٹتا رہ جاتا ہے' دو دن تک ہاتھوں سے قورمے کی خوشبو ہی نہیں جاتی۔" اس نے اپنی شان میں خود ہی قصیدہ پڑھا تو وہ ہنس پڑیں۔

قورمے کے لیے ڈھیر ساری پیاز باریک باریک کاٹتے ہوئے وہ زور و شور سے آنسو بہانے میں مصروف تھی۔

"ڈاکٹر آصفہ! یہ ایگری کلچرسٹ اور بوٹنی میں ریسرچ کرنے والے لوگ آخر کر کیا رہے ہیں جو اب تک انہوں نے ایسی پیاز نہیں اگائی جسے کاٹیں تو آنکھوں سے آنسو تو نہ نکلیں۔" آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے کو دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"کچھ چاہیے اسفند؟" وہ اسے جواب دینے کے بجائے اسفندیار سے مخاطب ہوئی تھیں جو اسی وقت کچن میں آیا تھا۔

"ہاں' میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ چائے پلا رہی ہیں تو پلائیں ورنہ میں چلوں۔"

"ابھی سارے چولہے بزی ہیں۔ تھوڑی دیر ٹھہرو اور یہ تمہیں جانے کی اتنی جلدی کس خوشی میں ہو رہی ہے۔" چپلی کبابوں کے لیے مسالہ تیار کرتے ہوئے انہوں نے اسے ٹوکا تھا۔

"ایک چکر ہاسپٹل کا لگانا ہے پھر اس کے بعد کشمالہ اور سائم کے ساتھ آؤٹنگ کا پروگرام ہے۔" وہ اسے مکمل طور پر نظرانداز کیے ان سے مصروف گفتگو تھا۔ اسے کچن میں دیکھ کر زوبیہ کے بے تکلف انداز اور فر فر چلتی زبان دونوں غائب ہو چکے تھے۔ وہ کچن سے چلا گیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا' اسے اندازہ تھا کہ اس کی ان لوگوں

سے بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے مگر پھر بھی اتنی زیادہ کا اسے اندازہ نہیں تھا۔

"زوبیہ! تم ذرا چائے بنا کر دے آؤ گی۔"

وہ پیاز کاٹ کر فارغ ہوئی تو انہوں نے اس سے کہا۔ ان دونوں کے لیے ٹرے میں چائے لے جاتے ہوئے اسے اپنی پوزیشن بڑی آکورڈ لگ رہی تھی

"آصفہ نے مہمان سے ہی کام کروانا شروع کر دیا۔" اس نے ٹرے سینٹرل ٹیبل پر رکھی تو ڈاکٹر شہنور نے افسوس سے کہا۔ جواب میں بغیر کچھ کہے صرف مسکرا کر وہ واپس کچن میں آ گئی۔

چائے پی کر وہ چلا گیا تو اسے اطمینان نصیب ہوا۔ بلاوجہ بندہ کونشیس ہو کر بیٹھے' سوچ سمجھ کر بات کرے' پہلے ہی وہ پیاز والی بات پر شرمندہ ہو رہی تھی۔

سارا دن وہ ان کے ساتھ مل کر کھانا پکواتی رہی تھی۔ اسفندیار کے جانے کے بعد ڈاکٹر شہنور بھی کچن میں آ گئے تھے۔ سلاد کے لیے سبزیاں انہوں نے ہی کاٹی تھیں اور ساتھ ساتھ اپنے چٹکلوں سے سب کو ہنساتے بھی رہے تھے۔

شام میں جب اس نے ان کا دیا ہوا بلیک سوٹ پہنا جس پر سرخ کلر سے ایپلک ورک بنا ہوا تھا تو وہ بہت خوش ہوئیں۔

"واؤ تمہارے بال کس قدر خوب صورت ہیں۔" انہوں نے اس کے لمبے سلکی بالوں کو ستائشی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ "اور تم اسی لیے انہیں اتنا لپیٹ لپاٹ کر رکھتی ہو کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔"

ان کے کمنٹس پر وہ مسکرا دی تھی۔ وہ روزانہ جیسا ہی ہیئر اسٹائل بنانے کا ارادہ رکھتی تھی مگر انہوں نے ٹوک دیا تھا۔

"ایسی بھی تم بڑھیا نہیں ہو گئی ہو' تمہاری ایج میں تو ہمیں فیشن کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ کھولنا نہیں ہے تو کم از کم چوٹی ہی باندھ لو۔"

ان کے اصرار پر چوٹی باندھتے اور پھر ہونٹوں پر لائٹ براؤن لپ اسٹک لگاتے ہوئے اس کے اپنے اندر جنگ سی چھڑ گئی تھی۔

"میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ خوب صورت آواز والی یہ لڑکی دیکھنے میں بھی اتنی ہی حسین ہو گی۔"

"ہم لوگ سمجھتے تھے' تم بدل گئی ہو' مگر بدلنا تو دور کی بات تم نے تو اپنے ہی گھر میں۔"

"ایسی بدکردار لڑکیوں کا تو پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دینا چاہیے۔"

کئی جملے اس کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح برسے تھے مگر پھر اچانک وہ ایک بات سوچ کر پرسکون ہو گئی تھی۔ ہاں یہاں کوئی اس کا ماضی نہیں جانتا۔ یہاں کوئی اس کے کردار پر شک نہیں کرے گا' یہاں کوئی اسے تیار ہونے پر طعنے نہیں دے گا۔ اس کے اندر مچلتی وہ لڑکی جس کا برسوں سے دل چاہتا تھا کہ وہ بھی اپنی ہم عمر لڑکیوں کی طرح سجے' تیار ہو اور جسے اس نے تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔ آج بہت خوش تھی۔

"ذرا سے چینج سے کتنی خوب صورت لگ رہی ہو تم۔" انہوں نے دل کھول کر اس کی تعریف کی۔

سخت ترین سردی کی وجہ سے ڈنر کا اہتمام اندر ہال میں کیا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ سب لوگ آنا شروع ہو گئے تھے۔ اسفندیار کے ساتھ بی بی جان' گیتی آرا' کشمالہ اور سائم بھی آئے تھے۔ وہ اس وقت ڈاکٹر شباب سے باتیں کر رہی تھی جب وہ داخل ہوئے۔

ڈاکٹر آصفہ اور ڈاکٹر شہنور نے بڑے پرتپاک انداز میں ان لوگوں کا خیر مقدم کیا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اس نے کن انکھیوں سے ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ سب ہی لوگ خود جا جا کر بی بی جان کو سلام کر رہے تھے اور وہ بزرگانہ شفقت سے سب کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں دے رہی تھیں۔

"آپ کیا ہم لوگوں سے عید بھی نہیں ملیں گی؟" سائم اور کشمالہ اسے دیکھتے ہی اس طرف آئے تھے اور ہم آواز ہو کر شکوہ کیا تھا۔

"ارے نہیں' میں بس آ ہی رہی تھی تم لوگوں کے پاس۔" وہ ان دونوں کے ساتھ پاس ہی رکھی نشستوں پر براجمان ہو چکی تھی۔

"میں سوچ رہی تھی کہ تم لوگ عید کرنے تو گھر ضرور آؤ گے۔" اس کے کہنے پر کشمالہ منہ پھلا کر بولی۔

"جی ہاں' تب ہی تو آج شہنور انکل کے ہاں ملی ہیں' وہ بھی اتفاقاً" اس دن افطار ڈنر میں بھی نہیں آئیں کل ہم

لوگ ملنے آئے تو پتا نہیں کہاں سیر سپاٹے کرنے نکلی ہوئی تھیں۔"

"تم لوگ آئے تھے؟" وہ حیران ہوئی۔

"تو کیا ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔" سائم نے آنکھیں نکالیں۔ ممی آرا اور بی بی جان دونوں اسے دیکھ چکی تھیں' اپنی بدتمیزی کا احساس ہوا تو وہ فوراً" ان لوگوں کو سلام کرنے کے لیے اٹھ گئی تھی۔ کیا سوچیں گی وہ کہ اسے اتنی تمیز بھی نہیں کہ بڑوں کو اٹھ کر سلام ہی کر لے۔ سائم اور کشمالہ بھی اس کے ساتھ ہی آ گئے تھے۔

"کیسی طبیعت ہے بیٹا؟" رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد بی بی جان نے اس سے دریافت کیا تو وہ حیران ہو کر سوچنے لگی کہ وہ بیمار ہوئی کب تھی۔

"اس دن میں نے تمہیں فون کیا تھا افطار پارٹی میں بلانے کے لیے' تو پتا چلا کہ تم بیماری کی وجہ سے جلدی چھٹی لے کر چلی گئی ہو۔" انہوں نے مزید وضاحت کی تو وہ حیران ہوئی 'ایسے کیا سرخاب کے پر لگے تھے اس میں جو انہوں نے اسے بطور خاص خود فون کیا تھا۔

"اس روز بھی اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم اسفی کی وجہ سے واپس جا رہی ہو اور اصلی ڈیوٹی کوئی نہیں ہے تو تمہیں بھی بھی نہیں جانے دیتی۔ لو یہ بھی کوئی بات ہوئی ہسپتال کا کام ہسپتال میں' گھر میں کوئی مالک' ملازم نہیں ہوتا اور یہ اسفی اوپر اوپر سے اکھڑا سخت لگتا ہے' اندر سے بڑا محبت کرنے والا ہے میرا بیٹا۔ کشمالہ بھی یہی کہہ رہی تھی اور مجھے بھی یہی لگا کہ ایسے شاید تم نہ آؤ' اس لیے خود فون کیا تھا تمہیں بلانے کے لیے' لیکن اسفی سے بات ہوئی وہ کہنے لگا وہ تو چھٹی لے کر چلی گئیں۔"

محبت کرنے والا پیارا بیٹا کچھ فاصلے پر کھڑا ڈاکٹر شہزور سے باتیں کر رہا تھا اور یقیناً" یہ تمام جملے اس نے ضرور سن بھی لیے تھے' اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ اتنی بری طرح تو وہ ان کے گھر جانے پر شرمندہ نہ ہوئی تھی جتنی اس وقت ان کے منہ سے یہ باتیں سن کر ہوئی تھی۔ اپنا جو بہت سنجیدہ 'لیے دیے رہنے والا' سوبر سا امیج وہ یہاں بنانے میں کامیاب ہوئی تھی کتنی بری طرح ٹوٹا تھا۔ سوبر بننے کے چکر میں وہ خاصی بے وقوفانہ اور احمقانہ حرکتیں کر چکی تھی مگر انہیں یہ بتایا کس نے؟

"یہ محترمہ ہیں ناں!" انہوں نے اس دن جب آپ ہم لوگوں سے ناراض ہو گئی تھیں' گھر واپس آ کر سب کے سامنے ساری بات دہرا دی تھی۔ حالانکہ میں نے کتنے اشارے کیے' گھر میں چٹکی تک کاٹی مگر یہ سب بولتی چلی گئیں جو جو کچھ آپ نے ہم لوگوں سے کہا تھا' سب بول دیا۔ وہ بھی ممی' بی بی جان اور لالہ کے سامنے۔" سائم نے کھانا کھاتے ہوئے اس کے پوچھنے پر کشمالہ کی طرف اشارا کر کے کہا تو اس کا دل چاہا تھا کہ یہاں سے نکل کر بھاگ جائے۔

"آپ مجھ سے ناراض ہو گئیں۔؟" کشمالہ ڈر گئی تھی۔ اسے بے ساختہ نادان دوست اور دانا دشمن والی کہاوت یاد آ گئی تھی۔

"نہیں۔ آپ سے ناراض ہو کر کہاں جاؤں گی۔" آئندہ کم از کم کشمالہ کے سامنے سوچ سمجھ کر بات کرنے کا سوچتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔

سسٹر رضیہ کو واپس جا کر ڈیوٹی جوائن کرنے کی جلدی تھی موقع غنیمت جان کر وہ بھی ان ہی کے ساتھ واپس آ گئی تھی۔ حالانکہ ابھی ڈنر چل رہا تھا' واپس جانے والی وہ دونوں سب سے پہلی مہمان تھیں۔

اگلے کئی دن وہ اسفندیار سے سامنا ہونے سے کتراتی رہی تھی۔

کشمالہ اور سائم عید کرتے ہی واپس چلے گئے تھے۔ جانے سے پہلے جب وہ لوگ اس سے ملنے آئے تو وہ ان دونوں کے ساتھ اسی جگہ آ گئی تھی جہاں وہ لوگ پہلی مرتبہ ملے تھے۔ گھاس پر چت لیٹے ہوئے سائم نے بڑے دکھ بھرے انداز میں اس سے پوچھا تھا۔

"زندیہ آپی! آخر ہم لوگ اس طرح چھپ چھپ کر کب تک ملتے رہیں گے۔" اس کے فلمی انداز میں یہ جملہ بولنے پر اسے بہت ہنسی آ گئی تھی۔

"اسے انڈین اور پاکستانی فلمیں ذرا کم دکھایا کرو۔" اس نے کشمالہ سے کہا۔

"دیکھیں ناں۔ ہاسپٹل میں ہم آپ سے نہیں مل سکتے' گھر آپ ہمارے نہیں آتیں' یہ سماج کی دیواریں آخر کب گریں گی۔"

"اب میں کچھ بولی تو یہ تمہاری عقل مند بہن صاحب

وہاں جا کر سب الم نشرح کر دیں گی۔ اس بات کا جواب میں انہیں بھی اکیلے میں دوں گی۔" اس بات پر کشمالہ کا اطمینان کیا تھا۔

پھر ان دونوں نے مل کر کافی دیر تک کشمالہ کی بے وقوفیوں کا ریکارڈ لگایا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس روز اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔ وہ فراغت سے بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ یونہی اونگھتے اونگھتے اسے شرافت بابا کا خیال آیا۔ بے چاروں کے دونوں گردے ناکارہ ہو گئے تھے اور اب ڈائیلسس کے سہارے وہ زندگی گزار رہے تھے۔ ہفتے میں تین بار ان کا ڈائیلسس ہوتا تھا۔ وہ اپنے گھر کے واحد کفیل تھے اور اب اس موذی مرض کے ہاتھوں بری طرح مصائب کا شکار ہو گئے تھے۔ سسٹر رضیہ نے اسے بتایا تھا کہ ایسے مریضوں کی اسفندیار بڑے خفیہ طریقے سے مدد کیا کرتا تھا' بلکہ صرف وہی کیا ڈاکٹر شہزور بھی۔ مگر اس مدد کا چرچا نہیں کیا جاتا تھا۔

ہاسپٹل کے اخراجات کے علاوہ بھی ایسے مریضوں کو مالی تعاون فراہم کیا جاتا تھا۔ ہاسپٹل میں کوئی امیر' ٹھیک ٹھاک پیسے والا آدمی داخل ہوتا تو اس کے ساتھ کوئی رو رعایت نہیں برتی جاتی تھی

کسی سردار کا بیٹا آج کل بھی وہاں ایڈمٹ تھا۔ وزیٹنگ آورز میں اس کے مسلسل ملاقاتیوں کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔ مردوں کے وارڈ میں اس کا اور ڈاکٹر آصف کا خاصا کم جانا ہوتا تھا مگر پرسوں ڈاکٹر تاجدار اور ڈاکٹر شہاب دونوں میں سے کوئی موجود نہیں تھا۔ اس لیے راؤنڈ پر وہ اسفندیار کے ساتھ آئی تھی۔ مختلف مریضوں سے نمٹتے ہوئے وہ اس کے کمرے کے پاس پہنچے تو اسفندیار کمرے میں داخل ہوتا ہوا اس سے بولا تھا۔

"بس آپ جائیں اب۔" وہ اس بات پر توجہ دیے بغیر کہ اس نے جانے کے لیے کیوں کہا ہے جان چھوٹی لاکھوں پائے والے انداز میں فوراً" وہاں سے چل دی تھی۔ اس کے ساتھ ہوتے ہوئے تو سر پر مسلسل تلوار لٹکی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

سسٹر سے تھوڑی دیر میں آنے کا کہتی وہ مردوں کے وارڈ میں آ گئی تھی۔ آج کل ایسا کوئی خاص سیریس پیشنٹ ایڈمٹ نہیں تھا' اس لیے اور وارڈز میں مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا' شرافت بابا ڈائیلسس ہونے کے بعد جس تکلیف سے گزرتے تھے وہ تو اب معمول کا حصہ تھی۔ ہر بار ڈائیلسس ہو جانے کے بعد ان کے کئی گھنٹے نہایت تکلیف اور اذیت میں گزرتے تھے۔ وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے دیکھ کر ان کی بوڑھی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے مسکرائی تھیں۔ آدھا پون گھنٹہ ان کے پاس بیٹھ کر وہ اٹھ گئی تھی۔ کوریڈور میں چلتے ہوئے اس نے آواز سنی تھی۔

"ایکسکیوزمی ڈاکٹر۔" وہ پلٹی تو اس کے حلیے سے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ پرسوں ایڈمٹ ہوا امیر کبیر جاگیردار کا بیٹا تھا۔ گلے میں سونے کی چین' کلائی میں قیمتی گھڑی' بیش قیمت لباس۔ اس کے ہر انداز سے امارت ٹپک رہی تھی۔

"جی۔" وہ اس کے پاس آ گئی۔

"میرا دل بہت بری طرح گھبرا رہا ہے' چکر آ رہے ہیں' ہاتھ پاؤں بے جان محسوس ہو رہے ہیں۔" وہ نقاہت زدہ آواز میں بولا تو وہ ایک دم الرٹ ہو گئی۔

"آپ بیڈ پر لیٹیے' میں چیک کرتی ہوں۔"

اس کے ساتھ وہ کمرے میں آ گئی۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے بمشکل چلتا بیڈ پر لیٹا تھا۔ وہ سنجیدگی سے اس کا معائنہ کر رہی تھی۔ سر جھکائے پوری تندہی سے۔ اچانک اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا' بے اختیار نظریں اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ بہت گہری بہت بے باک نگاہوں سے اسی سمت دیکھتا نظر آیا۔ اس کے دیکھنے پر بھی اس نے اپنی نظریں نہیں ہٹائی تھیں' اسے ان نگاہوں سے خوف آیا بے ساختہ انداز میں وہ پیچھے ہٹنے لگی لیکن اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آپ کو کبھی کسی نے بتایا ہے ڈاکٹر! آپ کتنی خوب صورت ہیں۔ میں نے اپنی اب تک کی زندگی میں اتنا مکمل حسن نہیں دیکھا۔" وہ مخمور لہجے میں بولا۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ۔ آپ ہوش میں تو ہیں۔ چھوڑیں میرا ہاتھ۔"

وہ بلند آواز میں چلائی اور ساتھ ہی اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے زور بھی لگایا تھا۔ دل خوف کے مارے بند ہونے کے قریب تھا جب اچانک اس نے خود ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا

اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"آئیے ڈاکٹر اسفند یار۔" اس کے منہ سے کلمۂ شکر نکلا تھا۔ بے اختیار پلٹ کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ "میں ابھی ڈاکٹر صاحب سے کہہ ہی رہا تھا کہ کاش ڈاکٹر اسفند یار آجائیں تو میرا بہتر ٹریٹمنٹ ہو سکے گا۔"

وہ بے غیرتی کی حد کرتا ہوا اتنے آرام سے پینترا بدل گیا کہ وہ ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔ خود اس سے تو نہ اس وقت کوئی بات کی جا رہی تھی نہ ہی کچھ سمجھ میں آرہا تھا۔ بس ہاتھ پاؤں بری طرح کانپ رہے تھے' ایسا لگ رہا تھا' کسی بھی لمحے وہ یہیں گر پڑے گی۔ اسفند یار آہستہ آہستہ چلتا اندر آگیا تھا لیکن اس نے ایک دفعہ بھی زوبیہ کی طرف نہیں دیکھا تھا مسلسل آذر سلطان کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں' مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ آپ کا ٹریٹمنٹ مجھے ہی کرنا پڑے گا۔" وہ بیڈ پر گرے ہوئے اسٹیتھسکوپ کو اٹھاتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولا۔

"آپ جا سکتی ہیں۔" ایک سرد کاٹتی ہوئی نظر اس پر ڈال کر کہا گیا تھا۔ اتنے سخت اور کرخت انداز میں اس نے اسے اس سے پہلے کبھی بات کرتے نہیں سنا تھا۔ وہ اس لہجے سے خائف ہوئی فوراً باہر نکل آئی۔ کوریڈور میں چلتے ہوئے وہ پیر رکھ کہیں رہی تھی اور پڑ کہیں رہے تھے' اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا یا اللہ یہ کیا ہونے جا رہا تھا میرے ساتھ۔ وہ اب تک کانپ رہی تھی۔ کمرے میں آکر سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہ گم صم بیٹھی کچھ بھی نہیں سوچ پا رہی تھی جب انٹر کام بجا تھا۔

"آپ ذرا میرے کمرے میں آئیے۔" وہی سرد لہجہ۔ وہ بمشکل تمام خود کو گھسیٹتی ہوئی اس کے کمرے میں آئی۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے وہ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ اسے اندر آتا دیکھ کر وہ رک گیا۔ اس کے عین سامنے آکر رکتے ہوئے وہ انتہائی مشتعل انداز میں بولا۔

"میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں ڈاکٹر زوبیہ خلیل! کہ یہ سب کیا تھا۔ آپ وہاں کیوں گئی تھیں؟ کس کی اجازت سے گئی تھیں؟ آپ کو خود کو تماشا بنانے کا شوق ہو تو ہو مگر مجھے اپنے ادارے کی نیک نامی بہت عزیز ہے۔" وہ غصے سے چیخ پڑا تھا۔

"کیا ڈاکٹر تاجدار ڈیوٹی پر موجود نہیں تھے۔ آخر ایسا کون سا کیس تھا جسے صرف آپ ہی ہینڈل کر سکتی تھیں' ڈاکٹر تاجدار نہیں۔" وہ چلا رہا تھا۔

"ہماری عزت کو داغ لگا کر آئی ہے یہ بے غیرت' اب میں اس کا خون کروں گا۔" اسے اسفند یار کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی بلکہ کچھ اور آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"آپ بالکل غلط سمجھ رہے ہیں' میں اس طرح کی لڑکی نہیں ہوں۔" آواز اس کے ہونٹوں سے بعد میں نکلی تھی آنسو پہلے نکل آئے تھے۔ وہ کبھی کسی کے سامنے نہیں روئی تھی اور اس شخص کے سامنے تو کبھی بھی نہیں رونا چاہتی تھی مگر اس وقت وہ اس کے سامنے کھڑی زار و قطار رو رہی تھی۔

اس کا جملہ اور رونا دونوں جیسے اس کے لیے بڑے غیر متوقع تھے' ایک آدھ سیکنڈ وہ خاموشی سے اسے سر جھکائے آنسو بہاتا دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر آہستگی سے بولا۔

"بیٹھ جائیے ڈاکٹر زوبیہ!" اس بار لہجہ معمول کے مطابق ہموار اور پُرسکون تھا۔ مگر وہ ایک دم تیزی سے مڑی تھی اور اسی طرح روتی ہوئی کمرے سے بھاگتی ہوئی چلی گئی تھی۔ واش روم میں خود کو بند کر کے فل اسپیڈ میں نل کھول کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میری بدنصیبی کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ یہاں کسی کو میرا ماضی نہیں پتا تھا میں بہت خوش تھی' سب مجھے بہت شریف' حیادار اور پاکباز لڑکی سمجھتے تھے مگر اب نہیں سمجھیں گے۔ ڈاکٹر اسفند یار کے سامنے کیا عزت رہ گئی میری۔ وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں جان بوجھ کر وہاں گئی' میں نے اسے خود ترغیب دی تھی۔ کل وہ یہی بات ڈاکٹر شہنور اور ڈاکٹر آصفہ کو بتائیں گے' پھر مجھے مشکوک کردار کا حامل قرار دے کر یہاں سے نکال دیا جائے گا اور پھر آہستہ آہستہ سب جان جائیں گے میری اصلیت' خجستہ' گل خان' کشمالہ' ضامن وہ سب جو مجھ سے پیار کرتے ہیں میرے منہ پر تھوکیں گے۔ اوہ میرے خدا مجھے موت دے دے۔ ابھی اسی لمحے' اسی پل' بس اب اور نہیں' اب نہیں جینا مجھے اور کتنی ذلت سہوں آخر اور کتنی۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں' میں ہاسٹل میں ہوں' کوئی پوچھے تو بتا دیجئے گا۔" پتا نہیں کتنی دیر بعد وہ واش روم سے نکلی تو تیز تیز چلتی سیدھی ریسیپشن پر آکر بولی تھی۔ اس وقت وہ کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی' نہ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر تاجدار کا' نہ سسٹر رضیہ کا' جلد سے جلد وہ اپنے کمرے میں جانا چاہتی تھی۔

ہاسپٹل کے احاطے سے نکل کر باغ میں آتے ہی وہ پوری رفتار سے بھاگتی ہوئی ہاسٹل میں آئی تھی۔ کمرا لاک کر کے وہ اوندھے منہ بیڈ پر گر پڑی تھی اور پھر جو آنسو بہنا شروع ہوئے تھے تو صبح تک نہیں رکے تھے۔

"ان سب کی نظروں سے گر کر کیسے زندہ رہوں گی۔ ڈاکٹر اسفند یار' ڈاکٹر شہنور اور ڈاکٹر آصفہ کمرے میں بلائیں گے۔ شوکاز نوٹس میرے سامنے رکھا جائے گا' میں اپنے حق میں کچھ بھی نہیں ثابت کر پاؤں گی' پھر اپنے ادارے کی نیک نامی برقرار رکھنے کے لیے مجھے یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا جائے گا۔ یا اللہ آج سورج نہ نکلے۔ آج صبح نہ ہو۔ یہ ذلت بھرا دن میری زندگی میں نہ آئے۔"

وہ رات بھر دعائیں کرتی رہی تھی۔

"شکر ہے' تمہارا ٹمپریچر کم تو ہوا۔" تکلیف سے کراہتے اس نے آنکھ کھولی تو ڈاکٹر آصفہ اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں۔

"خود پر کام کا زیادہ بوجھ سوار کر لیتی ہو' طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو کل چھٹی لے لیتیں۔" وہ اپنائیت بھری خفگی سے گویا ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے جھانکتی اپنائیت اور تشویش اسے حیرت میں مبتلا کر گئی تھی۔

"اچھا اب ہمت کر کے ذرا آنکھیں کھولو اور تھوڑا سا دودھ پی لو تاکہ دوا دی جا سکے۔"

انہوں نے پیچھے تکیہ لگا کر اسے اٹھا کر بٹھایا اور برابر میں کھڑی سسٹر سے دودھ لانے کے لیے کہا۔ نظریں سامنے دیوار پر لگی گھڑی پر پڑیں تو شام کے پانچ بج رہے تھے' اسے بخار کب چڑھا' وہ نہیں جانتی تھی مگر اتنا یاد تھا کہ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا' آنکھیں کھینچ سے کھل نہیں رہی تھیں اور شاید کوئی زور زور سے اس کے کمرے کا دروازہ پیٹ رہا تھا۔ سوتے جاگتے اس نے سسٹر رضیہ کی اور شاید کسی اور کی بھی آوازیں اور دروازے پر دستک سنی تھی۔

رات تک ڈاکٹر شہنور' ڈاکٹر شہاب اور ڈاکٹر تاجدار کے علاوہ بھی ہاسپٹل کے کئی افراد اس کی عیادت کے لیے آچکے تھے۔ ہر کوئی اس کے لیے فکر مند تھا' اس کے سرہانے پھولوں' پھلوں اور دواؤں کے انبار جمع تھے۔

ڈاکٹر آصفہ رات تک اس کے پاس رہی تھیں۔ اگلے روز صبح ہی صبح خجستہ چلی آئی تھی۔ اسے یقیناً شہباز نے اطلاع دی ہوگی۔

"اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتیں ناں' دیکھیں تو کیسا زرد چہرہ ہو رہا ہے۔ میں آپ کے لیے یہ حلوہ بنا کر لائی ہوں' کھا کر دیکھیں' دیسی گھی میں بنایا ہے' کھا کر طاقت آجائے گی۔"

وہ اپنے ہاتھ سے چمچے بھر بھر کر اس کے منہ میں حلوہ ڈال رہی تھی۔ اس کے بعد گل خان اور اس کی بیوی' وہ خود اپنے آپ سے بار بار ایک ہی سوال کر رہی تھی کہ کیا میں اتنی اہم ہوں۔ اتنی اہم کہ سب میری فکر کر رہے ہیں' اس کے نظروں کے سامنے ایسے کتنے منظر گھوم گئے جب اس کے خونی رشتوں نے اس کی دکھ بیماری میں اسے نظر انداز کیا تھا۔ وہ کھانا کیوں نہیں کھا رہی یا وہ صبح سے کمرے میں کیوں پڑی ہے' کبھی کسی نے نہیں پوچھا تھا اور یہ بالکل غیر اور انجان لوگ۔ کس طرح وہ سب اپنی بے لوث چاہت اس پر نچھاور کر رہے تھے۔

ڈاکٹر شہنور اور ڈاکٹر آصفہ نے آج بھی ہاسٹل میں خود آکر اس کی خیریت پوچھی تھی اور ڈاکٹر شہاب اور ڈاکٹر تاجدار نے اسے فون کر کے طبیعت پوچھی تھی۔

سارے اسٹاف کی طرف سے Get well soon

کا کارڈ اور پھول' بیماری کے یہ چار دن اس سے سب کی والہانہ چاہت کا کتنا بھرپور اظہار کر گئے تھے۔ کسی کی آنکھ نہیں بدلی' کسی کا لہجہ تبدیل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اتنی فکر اور اتنا خیال تو اس کا اس سے پہلے کبھی رکھا بھی نہیں گیا تھا' جتنا ان چار دنوں میں۔ مگر وہ ڈاکٹر اسفندیار..... "اس نے کئی بار سوچا تھا۔ شاید وہ یہ بات کسی کو بتانا نہیں چاہتے' مگر یقیناً" اب تک انہوں نے میرے بارے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ تو کر ہی لیا ہوگا اور کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ان کے کہنے سے پہلے میں خود اپنا استعفیٰ انہیں پیش کر دوں۔ کم از کم نکالے جانے کی ذلت سے تو بچ جاؤں گی۔ وہ ابھی یہ سوچنا نہیں چاہتی تھی کہ یہاں سے جا کر کرے گی کیا۔

وہ رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھی اپنا استعفیٰ لکھنے میں مصروف تھی جب اسے ڈاکٹر اسفندیار کے ٹیلی فون کی اطلاع ملی تھی۔ ہاسٹل کے کامن روم میں فون رکھا تھا وہ وہاں آ گئی تھی۔

"السلام علیکم۔" بہت بجھے بجھے انداز میں اس نے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم سلام' طبیعت کیسی ہے آپ کی؟" بڑے خشک سے انداز میں دریافت کیا گیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اگلی کسی بات سے خائف ہوتی بمشکل بولی تھی۔

"طبیعت ٹھیک ہے تو آپ ڈیوٹی پر کیوں نہیں آ رہیں۔ آپ کی وجہ سے ڈاکٹر آصفہ پر کام کا کتنا زیادہ بوجھ پڑ گیا ہے۔ کچھ اندازہ ہے آپ کو۔" اس کا لہجہ مالکانہ تحکم لیے ہوئے تھا۔

"میں کل سے آ جاؤں گی۔" اس کے ذہن میں رہ رہ کر اپنا ادھورا استعفیٰ گھوم رہا تھا۔

دوسری طرف جواب میں "ٹھیک ہے" کہہ کر لائن ڈس کنیکٹ کر دی گئی تھی۔

کمرے میں آ کر استعفیٰ ڈسٹ بن میں پھاڑ کر ڈالتے ہوئے وہ ایک دم پرسکون ہو گئی تھی یوں جیسے کسی پھانسی پانے والے مجرم کی اچانک سزا معاف ہو جائے۔ اسے زندگی میں کبھی کہیں معافی نہیں ملی تھی اور یہاں جہاں وہ معافی کی امید ہی نہیں رکھتی تھی وہاں..... "کیا زندگی بھی کبھی اس طرح اچانک مہربان بھی ہو جاتی ہے؟" اس نے خود سے حیرت اور خوشی سے دریافت کیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ ہاسپٹل آئی تو سب نے بڑی گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا تھا یوں جیسے وہ کوئی وی آئی پی ہے۔ اسفندیار کے اسٹائل میں بھی کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ ہمیشہ جیسا روکھا اور بے لچک لہجہ۔ وہی بات کرنے کا پروفیشنل انداز' غلطی کرنے پر ڈانٹ ڈپٹ' انہیں کچھ نہیں بدلا تھا۔

اسے دوبارہ جوائن کیے کافی دن ہو گئے تھے اور اسفندیار نے ایک دفعہ بھی اس واقعہ کے حوالے سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ کئی بار اس کے کمرے میں جا کر کام کی بات کرنے کے بعد اس کا دل چاہا وہ خود ہی اس روز کا ذکر چھیڑ دے۔ مگر ہر بار اس کے سامنے جاتے ہی ہمت جواب دے جاتی تھی۔ ڈاکٹر آصفہ سے اس نے باتوں باتوں میں آذر سلطان کے بارے میں پوچھا تو وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولیں۔

"اسے تو کافی دن ہوئے ڈسچارج کر دیا اسفند نے' میرا خیال ہے تم بیمار تھیں تب۔ ویسے وہ کچھ خاص بیمار تھا بھی نہیں۔ ذرا بلڈ پریشر شوٹ کیا کر گیا۔ موصوف سمجھے' مجھے ہارٹ ڈیزیز ہو گئی ہے۔ میں تو اسفند سے کہہ رہی تھی ہمارا کیا جاتا ہے ایڈمٹ رہنے دو۔ ذرا بل ہی کچھ تگڑا بن جائے گا۔" وہ مسکرائی تھیں' زوبیہ مسکرا نہیں سکی تھی۔

ہر طرف سے اطمینان تھا سوائے اسفندیار کے۔ وہ ایک شخص تو ایسا تھا ناں یہاں پر جو اسے غلط سمجھ رہا تھا۔ کم از کم اس ایک شخص کی نظروں سے تو وہ گر گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"ڈاکٹر اسفندیار! میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔"

اس کے ساتھ کوریڈور میں چلتے ہوئے اس نے آہستہ آواز میں کہا تھا۔ وہ اسے راؤنڈ کے بعد ایک پیشنٹ کے بارے میں ہدایات دے کر فارغ ہوا تھا اور اب یقیناً" اس کا رخ اپنے کمرے ہی کی طرف تھا۔ ایک مہینے سے وہ جس اذیت سے گزر رہی تھی۔ اب اس سے نجات پانا چاہتی تھی۔

"بات تو مجھے بھی آپ سے ایک کرنی تھی۔" وہ اپنے کمرے کے سامنے پہنچ کر رکتا ہوا بڑے نارمل انداز میں چونکے بغیر بولا تھا۔ وہ ایک دم کونشس ہو گئی' انہیں کیا بات کرنی ہے' وہ جلدی سے سوچنے لگی تھی۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو پہلے میں اپنی بات کہہ دوں؟" وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ بھی پیچھے پیچھے اندر آ گئی تھی۔ ابھی بات شروع نہیں کی گئی تھی اور ہارٹ بیٹ تیز ہو گئی تھی۔ اس کی طرف دیکھے بغیر وہ اپنی سیٹ سنبھال چکا تھا۔ کتنی مشکل سے اس نے ہمت جمع کی تھی اس سے بات کرنے کے لیے اور اب وہ پتا نہیں کیا کہنے والا تھا' پتا نہیں اس کی بات کے بعد وہ کچھ کہہ پائے گی یا نہیں۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی تھی۔

"بی بی جان پوچھ رہی تھیں کہ یہ آپ کی 'ٹیچر' آخر کب آئے گی۔؟" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا تھا۔

"جی؟" وہ ہونق نظروں سے اسے تک رہی تھی۔ اس کی بات سر سے گزر گئی تھی۔

"ہاں سنا ہے' آپ پھر کسی دن آنے کا وعدہ کر کے آئی تھیں ان سے۔" وہ بدستور سنجیدہ تھا۔

وہ اس بات پر اتنی حیران تھی کہ کچھ بول ہی نہیں پائی۔ ہاسپٹل کے اندر بیٹھ کر ایک بالکل گھریلو سی بات اور وہ بھی اپنی ایک جونیئر ڈاکٹر سے۔

"اتنی حیران کیوں ہو رہی ہیں۔ آپ کہہ کر آئی تھیں ناں ان سے بھی پھر آنے کے لیے۔" سخت گیر لہجے میں سوال پوچھا گیا تھا۔ اس کے بے وقوفوں کی طرح گردن ہلا دینے پر وہ فوراً" بولا۔

"ٹھیک ہے پھر آج آپ وہاں آ رہی ہیں۔ آٹھ بجے آپ کی ڈیوٹی ختم ہوگی' میں ڈرائیور بھجوا دوں گا۔"

وہ انٹرکام اٹھا کر ڈاکٹر شاب کو اپنے کمرے میں آنے کا کہنے لگا تھا۔ اس کام سے فارغ ہوا تو اسے بیٹھا دیکھ کر حیرانی سے بولا۔

"آپ اب تک بیٹھی ہوئی ہیں' جائیے' جا کر اپنا کام کیجئے۔"

"ڈاکٹر اسفند! یہ رہیں ساری رپورٹس۔" ڈاکٹر شاب اندر آتے ہوئے بولا تو وہ خاموشی سے کرسی کھسکا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"انہیں پتا نہیں' میں ان سے کیا بات کرنا چاہتی ہوں' اور شاید اسی لیے انہوں نے مجھے اپنے گھر بلایا ہے۔ یہاں انہوں نے وہ بات کسی کو بھی نہیں بتائی اور یقیناً" وہ اس بات کو سب سے چھپانا چاہتے ہیں۔ اس لیے مجھے وہاں آنے کے لیے کہا ہے۔" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

ٹھیک آٹھ بجے ڈرائیور اسے لینے آ گیا۔ ملازم کی ہمراہی میں وہ اندر داخل ہوئی تو گیتی آرا نے اس کا استقبال کیا۔

"اسفی نے تمہارے آنے کا بتایا تو اتنی خوشی ہوئی' کشمالہ تو اسی بات پر جھگڑتی ہوئی گئی تھی اسفی سے کہ' آپ کی وجہ سے ہماری زوبیہ آپی یہاں نہیں آتیں۔" وہ اس بات پر شرمندگی سے سر جھکا گئی تھی۔

تھوڑی دیر میں بی بی جان بھی وہاں آ گئی تھیں۔ ان کی گفتگو کا موضوع کشمالہ' سائم اور اسفندیار تھے۔

"آرام سے بیٹھو' سردی تو نہیں لگ رہی' ہیٹر آن کرواؤں۔" بیچ بیچ میں یہ فقرے بھی بولے جا رہے تھے۔

اسے بلا کر وہ خود پتا نہیں کہاں غائب تھا' وہ اس کی غیر موجودگی پر تھوڑی بدمزہ ہوئی تھی۔ ملازم نے آ کر کھانا لگ جانے کی اطلاع دی تو گیتی آرا بولیں۔

"اسفی کو بھی بلا لو۔" اس پر نظر پڑی تو خود ہی وضاحت کرنے لگیں۔

"اس کے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے' ان کو رخصت کر کے کمپیوٹر کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کھانا لگ جائے تو بلا لیجئے گا۔"

وہ ان دونوں کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھی جب وہ ڈائننگ روم میں داخل ہوا۔

"السلام علیکم!" زوبیہ نے سلام کیا تو کرسی سنبھالتے ہوئے اس نے اس کے سلام کا جواب دیا تھا' اس کے بعد وہ کھانا کھانے میں اس طرح مگن ہوا جیسے دن بھر کچھ کھایا ہی نہیں تھا۔ بی بی جان اور گیتی آرا البتہ اس کی تواضع میں مصروف تھیں۔

"یہ چکن ٹرائی کرو۔ اسفی کو بڑی پسند ہے' میرے ہاتھ کی بنی یہ ڈش' کہتا ہے اس میں پنیر کی وجہ سے زبردست فلیور آ جاتا ہے۔"

"یہ فروٹ سلاد۔"

"اچھا ایپل پائی۔" دونوں میزبانی کے فرائض بحسن وخوبی انجام دے رہی تھیں۔

اسفندیار نے کھانے کے دوران ایک دو مرتبہ ہی سر اٹھایا تھا اور وہ بھی بی بی جان کی کسی بات کا جواب دینے کے

لیے' اسے اس کا رویہ بہت برا لگا تھا۔

"خود بلا کر اب اس طرح ظاہر کر رہے ہیں جیسے میں منہ اٹھا کر خود چلی آئی ہوں۔" کھانے سے فارغ ہو کر سب واپس لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ کافی کا کپ خالی کرتے ہی وہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

وہ لاؤنج میں آتے ہی کسی سے فون پر بات کرنے لگا تھا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر اس نے ایک دم خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

"آئیے' میں آپ کو باہر تک چھوڑ آؤں۔" بی بی جان رکنے کے لیے اصرار کر رہی تھیں اور بیٹا بھیجنے پر تیار۔ ان دونوں سے دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہ اس کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔ چپ چاپ روش پر چلتے ہوئے وہ دونوں مرکزی گیٹ سے باہر نکل آئے۔

"آپ کیا کہنا چاہتی تھیں؟" دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے وہ بہت لاپروا انداز میں چلتے ہوئے بولا تھا۔ وہ جو اب تک مکمل طور پر مایوس ہو چکی تھی' ایک دم چونک گئی۔

"میں... وہ اس دن کے بارے میں۔" وہ بہت مشکلوں سے اٹکتے ہوئے بول پائی تھی۔ "آپ پتا نہیں کیا سمجھے' میں تو بس... پتا نہیں آپ نے کیا سوچا ہو گا۔"

اس کے منہ سے بے ربط الفاظ نکل رہے تھے۔ وہ رک کر سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا تھا جبکہ وہ اس کی طرف دیکھنے سے ہر ممکن حد تک گریز کر رہی تھی۔

"میں تو ہر وقت ہی کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہوں اور میرا خیال ہے ہر نارمل آدمی ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچ رہا ہوتا ہے۔"

اس وقت وہ اس جملے بازی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی' کسی قسم کی طنزیہ گفتگو اس وقت وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

"پلیز ڈاکٹر اسفند یار۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

"آپ بہت اچھی ہیں زوبیہ اور یہ بات آپ کو میرے یا یہاں موجود کسی بھی دوسرے فرد کے سامنے ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں' ہم سب جانتے ہیں آپ بہت اچھی ہیں اور اس اچھائی کو ماننے کے لیے مجھے یا کسی اور کو کوئی گواہی' کوئی ثبوت اور کوئی سرٹیفکیٹ درکار نہیں۔"

سنجیدگی کے ساتھ ساتھ لہجے میں ایک نامحسوس سی اپنائیت بھی تھی۔

"آپ کو یہاں اپائنٹ کرنے کا فیصلہ سو فیصد میرا اپنا تھا اور اپنے اس فیصلے پر میں جتنا کل مطمئن تھا' اتنا ہی آج بھی ہوں۔"

وہ آنسو بھری نگاہیں اٹھا کر تحیر سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی جو اس کے سامنے کھڑا ہمیشہ سے مختلف انداز میں بات کر رہا تھا۔

"ڈاکٹر شنور اور ڈاکٹر آصفہ جو آپ کے مقابلے میں ایک اور ڈاکٹر کو اپائنٹ کرنے کے حق میں تھے' وہ دونوں بھی آج سے کئی ماہ پہلے میرے انتخاب کی داد دے چکے ہیں۔ اس وقت انہیں میرے فیصلے سے اختلاف تھا۔ آپ سیکنڈ چوائس تھیں' اس لیے کہ دوسری ڈاکٹر آپ سے زیادہ قابل اور ذہین تھی۔ اکیڈمک کیریئر میں تھرو آؤٹ پوزیشن ہولڈر۔ بہت پُراعتماد' بہت competent مگر میں نے اس پر آپ کو ترجیح دی تھی' اس لیے کہ مجھے آپ میں ایک ہمدرد اور اچھا انسان نظر آیا تھا اور میں نے جیسا سوچا تھا آپ ویسی ثابت ہوئیں' اگرچہ پروفیشنلی آپ میں بہت سی خامیاں تھیں' ادھر مریض کی حالت بگڑی ادھر آپ کے ہاتھ پاؤں کانپنے شروع ہوئے' مریض سے پہلے آپ ٹھنڈی ہو جاتی تھیں مگر مجھے یقین تھا یہ کمزوری وقت کے ساتھ ساتھ خود بخود دور ہو جائے گی۔ ایک ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے آپ میں جو کمزوریاں ہوں' وہ تو دور کی جا سکتی ہیں مگر ایک انسان ہونے کی حیثیت سے جو کمزوریاں ہوں' وہ دور نہیں ہو سکتیں۔ میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی یہ خوبی آپ کے بہت کام آئے گی' آپ میڈیسن کی فیلڈ میں بہت آگے جائیں گی اس لیے کہ آپ کا خلوص اور محبت بھرا رویہ آپ کے سب سے کامیاب ہتھیار ہیں۔"

وہ اتنے کھلے دل سے اس کی تعریف کر رہا تھا' وہ جو بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

"ایک اچھی ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ایک بہت اچھی کک بھی ہیں' قورمہ اور گلاب جامن بہت اچھے بناتی ہیں۔"

اسی بردباری سے یہ جملہ بھی بولا گیا تھا۔ چہرے پر

مسکراہٹ نام کی کسی چیز کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتی حیرانی نظر انداز کر کے وہ دوبارہ چلنے لگا تھا بہت آہستہ جیسے چہل قدمی کر رہے ہوں۔

"مگر ظاہری بات ہے' اللہ تعالیٰ نے مکمل تو کسی انسان کو نہیں بنایا سب میں ہی کچھ نہ کچھ کمزوریاں یا خامیاں بھی ضرور ہوتی ہیں۔"

"مگر آپ میں جو دو بڑی خامیاں ہیں' وہ اتنی خطرناک ہیں کہ آپ کی خوبیوں کو بھی دھندلا دیتی ہیں۔ اگر آپ ان کمزوریوں پر قابو پالیں تو ایک بہترین انسان کہلائی جا سکتی ہیں۔"

وہ ساتھ چلتے ہوئے بس خاموشی سے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ ڈرائیور ان لوگوں کو دور سے ہی آتا دیکھ کر گاڑی کا دروازہ کھول چکا تھا۔

"پہلی خامی تو یہ ہے کہ آپ عقل کا استعمال بالکل نہیں کرتیں دوسری خامی آپ کی انتہائی حدوں کو چھوتی جلد بازی اور جذباتی طرز عمل۔ کسی بھی مشکل ترین وقت میں انسان جو آخری بری بات سب سے آخر میں سوچتا ہے۔ آپ وہ سب سے پہلے سوچ لیتی ہیں اور نہ صرف یہ کہ سوچ لیتی ہیں بلکہ اپنی منفی سوچوں کے نتیجے میں اکثر خود کو نقصان بھی پہنچاتی ہیں۔"

اسے عقل والی بات تھوڑی سی بری لگی تھی اور وہ اس کے چہرے سے یہ بات بھانپ بھی گیا تھا۔ مگر اس کے تاثرات سے متاثر ہوئے بغیر اس نے اسی سنجیدگی سے اپنی بات جاری رکھی تھی۔

"جہاں تک عقل والی بات کا تعلق ہے تو ——

میرے پاس آپ کی سابقہ کئی باتوں کے حوالے ہیں۔ لیکن اگر انہیں چھوڑ کر حال کی بات کی جائے تو اگر آپ میں عقل نام کی کوئی چیز ہوتی تو آج مجھے آپ کے سامنے یہ طویل تقریر نہ کرنی پڑ رہی ہوتی۔ مجھے مختصر اور ٹو دا پوائنٹ بات کرنے کی عادت ہے اور میرے گرد موجود تمام لوگ میری اس عادت سے واقف ہیں مگر آپ نہیں' اس روز راؤنڈ کے دوران میں نے آپ کو خاص طور پر اس کمرے میں جانے سے روکا تھا' آپ کے اندر جانے میں کوئی حرج نہیں تھا مگر میں آپ کو یاد دہانی کرانا چاہتا تھا کہ آپ نے یہاں نہیں جانا' کیوں؟ اس لیے کہ اپنے ہاں کام کرنے والے ہر شخص کی حفاظت میرے ذمے ہے اور میں جانتا تھا کہ آپ راتوں کو مٹرگشت کی بہت شوقین ہیں' مجھے پتا تھا' شرافت بابا کا ڈایالیسس جس دن ہو' اس رات آپ وہاں ضرور پہنچتی ہیں' آپ کو سمجھانے کے لیے کہ یہاں نہیں آنا' میں نے آپ کو خاص طور پر وہاں سے بھیج دیا مگر شاید یہاں میں کم عقل ثابت ہوا جو آپ کی صلاحیتوں کا غلط تجزیہ کیا۔ آپ کی سمجھ میں میری بات ہی نہیں آئی۔

پھر مزید دوسری بات جلد بازی اور جذباتی پن' وہ آگے کے واقعات میں نظر آتا ہے۔ یعنی آئندہ میں آپ کو ہر بات بالکل مکمل کر وضاحت سے سمجھایا کروں تاکہ دوبارہ کوئی بدترین صورت حال پیش نہ آئے۔"

وہ گاڑی کے پاس پہنچ کر رک گیا تھا۔

"انسانی ہمدردی اور خدمت خلق اپنی جگہ مگر آئندہ رات کے وقت آپ اگر مجھے کبھی بھی اکیلی مردوں کے وارڈ میں پرائیویٹ رومز کے پاس نظر بھی آئیں تو اس بار عقل کو میں ایک طرف رکھ دوں گا۔"

ڈرائیور کو گاڑی اسٹارٹ کرنے کا اشارا کرتے ہوئے اسے گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہا گیا تھا۔

"آپ بہت اچھی ہیں زوبیہ اور یہ بات آپ کو میرے یا یہاں موجود کسی بھی دوسرے فرد کے سامنے ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

کیسا مرہم رکھا تھا ان لفظوں نے اس کے کئی برسوں کے گھاؤ پر۔ زندگی کے کتنے سالوں بعد کسی نے اسے اچھا کہا تھا' کب کب کے زخم اچانک مندمل ہو گئے تھے۔ کتنے دنوں بعد وہ سکون سے سوئی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بوجھ تھا روح پر جو اتر گیا۔ صبح سو کر اٹھی تو کمبل ایک طرف پھینکتے ہوئے اچھل کر بیڈ سے اتری تھی اور آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"آپ بہت اچھی ہیں زوبیہ۔" اپنی حرکت پر وہ خود ہی کھلکھلا کر ہنس بھی پڑی تھی۔

گھاس کی قطع برید کرتے شہباز نے سلام دعا کے بعد اسے روک لیا تھا۔

"اماں کے جوڑوں میں درد ہے' کہہ رہی تھیں' کوئی دوائی دے دیں۔"

شہباز سے بات چیت میں دس منٹ لگ گئے تھے' اندر گھستے ہی ڈاکٹر آصفہ' اسفند یار اور شہاب سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی جو آپریشن تھیٹر سے باہر نکل رہے تھے۔

"آپ پورے پندرہ منٹ لیٹ ہیں۔" اب اگر اس کی گھڑی پانچ منٹ آگے تھی تو اس میں اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا مگر چپ چاپ سر جھکا کر بالکل خاموشی سے اس نے پندرہ منٹ لیٹ آنے پر لیکچر سنا تھا وہ بھی ان دونوں کے سامنے۔

ڈانٹ ڈپٹ کر اسفندیار اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ چلتے ہوئے وہ اپنے لیٹ ہو جانے کی وضاحت کر کے' ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی تو شہاب حیرت سے بولا۔

"آج ڈانٹ کھا کر آپ بڑی پُرسکون ہیں' پہلے تو دو دو گھنٹے منہ سجائے رکھتی تھیں۔ لگتا ہے' ہماری طرح آپ بھی ڈانٹ پروف ہوتی جا رہی ہیں۔"

اس کے کمنٹس پر ڈاکٹر آصفہ کے ساتھ وہ بھی ہنس پڑی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

خالہ امی کا خط آیا تھا' شہلا کی شادی ہو رہی تھی لڑکے والے خالو کے کوئی پرانے واقف کار تھے۔ لڑکے کی دبئی میں جاب تھی' اسے شہلا کی شادی کا پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی تھی' کتنی فکر مند تھیں' خالہ امی اس کے رشتے کے لیے۔ انہوں نے خط میں اسے شادی میں شرکت کرنے کی دعوت دی تھی' مگر وہ محسوس کر سکتی تھی کہ وہ دل سے چاہے اسے بلانا چاہتی بھی ہوں مگر پھر بھی دعا ہی کر رہی ہوں گی کہ وہ نہ آئے۔ ظاہر ہے اس سے زیادہ ان کے لیے بیٹے بہو کا رویہ اہم تھا۔ پھر وہ خود بھی جانا نہیں چاہتی تھی پہلے ہی بھابی نے شہلا کا رشتہ طے نہ ہونے کا سبب اس کی ذات کو ٹھہرا دیا تھا اب وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ جائے اور وہاں ایسی ویسی کوئی بات ہو جس سے بدمزگی بڑھے۔ یہی سب سوچ کر اس نے جوابی خط کے ساتھ نقد رقم یہ کہہ کر بھجوا دی تھی کہ ان پیسوں سے شہلا اپنی پسند کا کوئی گفٹ لے لے۔ ہر مہینے پیسے تو وہ انہیں ویسے ہی بھیجا کرتی تھی اور اس کے پاس تھا ہی کون' جس پر وہ کما کر خرچ کرتی۔

ڈاکٹر آصفہ اور ڈاکٹر شہزور امریکہ اپنی بیٹی سے ملنے گئے تھے' وہ واپس آئے تو اسفندیار امریکہ چلا گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس روز سائم کا فون آیا تو وہ خوش ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی ہوئی۔

"کہاں سے فون کر رہے ہو؟"

"جناب ابھی سے بات کر رہا ہوں اور اب کے فائنل ایگزامز کے بعد لمبی چھٹیوں پر آیا ہوں۔" وہ امتحان سے فراغت مل جانے کے بعد والی مخصوص بے فکری اور خوشی جو ہر طالب علم محسوس کرتا ہے سے سرشار ہو کر بول رہا تھا۔

اس نے سائم سے تو کچھ نہیں کہا تھا مگر اس روز ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد وہ ان کے گھر آ گئی تھی۔

"کشمالہ کے بغیر عجیب سا لگ رہا ہے۔" وہ بی بی جان اور گیتی آرا کے پاس ہی بیٹھنے لگی تھی مگر سائم اسے اپنا نیا میوزک سسٹم دکھانے اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔

"لالہ نے برتھ ڈے پر گفٹ کیا ہے۔" وہ بیڈ پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔

"وہ محترمہ بھی آنے کے لیے پر تول رہی ہیں' کہہ رہی تھیں جیسے ہی وائیوا ختم ہوئے' وہ فوراً نازل ہو جائیں گی۔" وہ اس کی بات کے جواب میں بولا تھا۔

"یہ تمہارے بابا کی تصویر ہے؟" وہ دیوار پر لگی فیملی فوٹو کو دیکھ کر پوچھنے لگی' گیتی آرا بڑی ینگ اور اب سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی تھیں۔ کشمالہ چھوٹی سی' بالکل گڑیا لگ رہی تھی اور سائم تو شاید چند ماہ کا تھا گیتی آرا کی گود میں اور ان کے برابر میں وہ دراز قامت' وجیہہ شخص جس میں سائم اور اسفندیار دونوں کی جھلک نظر آ رہی تھی دل آویز مسکراہٹ سجائے کھڑا تھا۔

"جی!" وہ مختصراً بولا تھا۔

"یہ اسٹڈی تو بہت زبردست ہے' اتنی ساری کتابیں دیکھ کر تو میرے منہ میں پانی آ رہا ہے۔" وہ دونوں کمرے سے نکلے تو سامنے ہی اسٹڈی دیکھ کر وہ رک گئی تھی۔ گلاس ڈور ہونے کی وجہ سے باہر سے ہی سب نظر آ رہا تھا' سائم اس کی دلچسپی محسوس کر کے سلائیڈنگ ڈور کھولتا اسے اسٹڈی میں لے آیا۔

وہ فخر سے بتا رہا تھا جبکہ وہ کمرے کے بیچوں بیچ رکھی بڑی سی میز کے کونے پر رکھی اردشیر خان اور اسفندیار کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ دونوں گھوڑوں پر سوار' اسفندیار اس تصویر میں بالکل نو عمر لڑکا لگ رہا تھا جبکہ اردشیر خان بھرپور جوان۔ تصویر میں وہ دونوں جس طرح ایک دوسرے کی

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں

طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ دونوں بھائیوں میں کتنی محبت ہو گی۔

"بابا اور لالہ میں بہت پیار تھا' لالہ اب بھی مجھ سے اور کشمالہ سے بابا کی باتیں کرتے ہیں' بابا پولو کے بہترین کھلاڑی تھے' لالہ کو بھی انہوں نے ہی پولو کھیلنا سکھایا اور اب لالہ مجھے سکھا رہے ہیں' زوبیہ آپی میں بالکل لالہ جیسا بننا چاہتا ہوں' ان کی طرح بے خوف' نڈر اور پُراعتماد۔"

وہ بڑے پُرعزم لہجے میں بولا تھا۔ وہ کتابوں پر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"بابا بہت اچھے تھے مگر لالہ جتنے بہادر نہیں تھے' میں لالہ جیسا بہادر اور شیر دل بننا چاہتا ہوں' کسی بات سے نہ گھبرانے والا۔"

اسے لگا جیسے سائم' اردشیر خان سے بہت زیادہ پیار کرنے کے باوجود کسی بات پر دل ہی دل میں ان سے خفا ہے۔ وہ اس بارے میں بہت کچھ پوچھتے پوچھتے خود ہی چپ ہو گئی' وہ اسے دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"اچھا' غصہ ور بھی ان ہی کی طرح بننا چاہتے ہو؟" وہ اس کا موڈ بدلنے کی خاطر ہنستے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ہاں' ان ہی کی طرح رعب دار اور غصہ ور۔" وہ بغیر جھجکے بولا تھا۔

"پھر تو ہماری دوستی بس کچھ ہی عرصہ اور چل پائے گی' اس کے بعد جناب سائم خان صاحب خونخوار انداز میں چنگھاڑتے پائے جائیں گے اور میں بے چاری تھر تھر کانپتی دور سے انہیں دیکھا کروں گی۔"

وہ اس کے ڈرنے کی ایکٹنگ کرنے پر ہنس پڑا تھا۔ وہاں جا کر بغیر کھانا کھائے آنے کا سوال ہی نہیں تھا' بی بی جان کے محبت بھرے اصرار پر وہ رک گئی تھی' اب اسے اس گھر میں اپنے آنے پر کوئی شرمندگی نہیں تھی' اسفندیار کی اس روز کی باتوں نے اسے احساس کمتری اور بہت سی فضول سوچوں سے آزاد کر دیا تھا۔ گو اس روز کے بعد وہ دوبارہ اپنے روٹین کے انداز میں ہی اس سے ملتا تھا' دوبارہ بھولے بھٹکے بھی نہ تو اس کی کوئی تعریف ہوئی تھی اور نہ کسی قسم کا غیر معمولی سلوک اس کے ساتھ برتا گیا تھا۔

خجستہ اپنی ساس کے ساتھ اس کے پاس ہاسپٹل آئی تھی' تفصیلی چیک اپ اور دوائیں وغیرہ دے کر انہیں فارغ کر کے بیٹھی تو ڈاکٹر آصفہ بھی وہیں آ گئی تھیں اور پتا نہیں اس کے کس انداز سے انہوں نے یہ بات پا لی تھی کہ وہ خوش ہے۔

"آپ کو کیسے پتا چلا؟" وہ ان کے استفسار پر حیرت سے پوچھنے لگی تھی۔

"تمہارے چہرے پر بکھری مسکراہٹ بتا رہی ہے کہ تم خوش ہو۔" وہ سر کرسی کی بیک سے ٹکاتے ہوئے خود بھی مسکرائی تھیں۔

"صحیح پہچانا آپ نے' اصل میں' میں خجستہ کی وجہ سے خوش ہوں۔ ابھی ابھی وہ چیک اپ کروا کر گئی ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ امید سے ہے' اس سے پہلے دو مرتبہ جو اس کے ساتھ ٹریجڈی ہو چکی اس وجہ سے اسے اس کی کا ذرا زیادہ ہی احساس ہونے لگا تھا۔ اتنی خوش ہے وہ ماں بننے پر کہ میں بتا نہیں سکتی۔" اس کے جواب پر وہ بے ساختہ بولیں۔

"اور اسے خوش دیکھ کر تم بھی خوش ہو۔" اس کی خجستہ سے دوستی اور چاہت کسی سے بھی چھپی ہوئی نہیں تھی۔

"ہاں' اور پتا ہے۔ میں نے اس کی ساس کو بھی کافی کچھ سمجھایا ہے' خجستہ کی صحت کے بارے میں' اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ خجستہ کا خیال رکھے گی اور اپنے بیٹے کو بھی اس کے ساتھ مار پیٹ نہیں کرنے دے گی۔"

وہ اپنی کامیابی پر بہت مسرور تھی۔ اپنی پیہم کوشش سے وہ کم از کم اس کی ساس کا دل تو موم کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اسفندیار واپس آ گیا تھا مگر اکیلا نہیں' اس کے ساتھ W.H.O کے ڈاکٹرز کی ایک ٹیم بھی تھی۔ چار مردوں اور ایک خاتون پر مشتمل وہ افراد W.H.O کی طرف سے تیسری دنیا کے ممالک خاص طور پر ساؤتھ ایشیا کے ترقی پذیر ممالک میں امدادی کام کرنے پر مامور تھے۔ ان ممالک میں مختلف ہیلتھ پروگرامز شروع کروانا' طبی عملے' خاص طور پہ ڈاکٹرز سے ملنا' دیہاتوں اور دور افتادہ علاقوں میں لوگوں کو درپیش طبی مسائل کا اندازہ لگانا اور ان کے حل کے لیے مشورے دینا وغیرہ ان کے کاموں میں شامل تھا۔ اس ٹیم میں موجود دو ڈاکٹرز' ڈاکٹر شہزور کے ہی اسٹوڈنٹس تھے' اسے ڈاکٹر شہزور کے پاکستانی ہونے پر بہت فخر کا احساس ہوا تھا جب وہ لوگ بڑے باادب انداز میں اپنے ذہین اور قابل استاد سے ملے تھے۔ وہ ان کی ایک ایک بات اتنے غور سے اور توجہ سے سن رہے تھے جیسے کوئی خزانہ ہے جو ان کی گفتگو میں چھپا ہے اور وہ اسے پانا چاہتے ہوں۔

اسفندیار نے ان لوگوں کو اپنے گھر کے گیسٹ رومز میں ٹھہرایا تھا۔ وہ لوگ چار روز کے مختصر دورے پر آئے تھے اور آتے ہی دو نے ہاسپٹل میں موجود سہولیات اور باقیوں نے علاقے کے لوگوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنی شروع کر دی تھیں۔

"ہمارا اگلا پروجیکٹ دانتوں اور آنکھوں کی جملہ بیماریوں کا علاج اور سرجری وغیرہ ہے' اس مقصد کے لیے ہم ڈینٹسٹ اور آئی سرجن اپائنٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" اسفندیار نے انہیں ہاسپٹل دکھاتے ہوئے بتایا تھا۔ ہیلینا رابرٹ کی اسفندیار کے ساتھ بے تکلفانہ بات چیت دیکھ کر اسے خاصا تعجب ہوا تھا۔ گو اسفندیار تو اپنے معمول کے لہجے میں ہی اس سے بات کر رہا تھا مگر وہ جواباً" جس بے تکلفی اور دوستانہ انداز میں بات کر رہی تھی اور مزید یہ کہ اسفندیار اسے مائنڈ بھی نہیں کر رہا تھا' وہ اسے حیران کرنے کے لیے کافی تھی۔

"یہ مغرور بندہ یونیورسٹی میں میرے ساتھ تھا نا' میں اس سے ایک سال جونیئر تھی۔" ہیلینا نے خود ہی اس کی حیرت دور کر دی تھی۔ وہ اسے علاقے کی عورتوں سے ملوانے لے گئی تھی جب راستے میں اس نے بتایا۔

"بہت لڑکیاں مرتی تھیں اس پر' مگر یہ مجال ہے جو کسی کو منہ لگائے' اب ایک تو بندہ ہینڈسم ہو' اس پر سے پراؤڈ بھی تو لڑکیاں تو پاگل ہو ہی جائیں گی' اس کی ایک کلاس فیلو تو اس کی خاطر مسلمان ہونے کے لیے بھی تیار تھی۔ جب اس نے پاکستان واپس آنے کا فیصلہ کیا تو اس نے مارے صدمے اور دکھ کے نیند کی گولیاں کھالی تھیں' وہ تو قسمت اچھی تھی جو محترمہ بچ گئیں۔" وہ بڑا بے باک اور بے فکر قہقہہ لگاتے ہوئے بولی تھی۔

"دراصل میں ہمارے ہاں کی لڑکیاں بڑا پسند کرتی ہیں مشرقی مردوں کو اور پھر مرد بھی اسفندیار جیسا ہو تو کیا ہی بات ہے۔ مگر یہ میرے علاوہ کسی سے بات نہیں کرتا تھا' میں اس کی واحد دوست تھی جو صنف نازک سے تعلق رکھتی تھی۔ حیرت یہ ہے کہ اس نے اب تک شادی کیوں نہیں کی' اس کی تو تب ہی انگیجمنٹ ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے خود بتایا تھا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے اپنی کزن سے اور وہ اسے پسند بھی کرتا ہے اور یہ کہ اسے کسی فارنر لڑکی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ پھر پڑھائی سے فارغ ہو کر میں سوئٹزرلینڈ واپس چلی گئی تو ہمارا آپس میں رابطہ بھی ختم ہو گیا۔ اب میں نے پوچھا تو بات ہنسی میں ٹال گیا۔"

وہ چپ چاپ اس کی ساری بات سن رہی تھی اسفندیار کا ذکر کرنے پر اس کے چہرے پر جو رنگ بکھرے تھے' انہیں دیکھ کر اس کا بے ساختہ دل چاہا کہ اس سے پوچھے۔

"ڈاکٹر ہیلینا! آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟"

ان لوگوں کے آنے کی وجہ سے کام کا سارا روٹین بدل گیا تھا۔ اسفندیار نے مہمانوں کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دینے کی سارے اسٹاف کو تاکید کر رکھی تھی۔ وہ بھی سب کی طرح مستعد تھی۔ اب انہیں یہ ریکارڈ درکار ہے' اب وہ فلاں جگہ دیکھنا چاہتے ہیں' مگر پھر بھی کوئی بات تھی جو اسے بے چین کر رہی تھی۔ ایک بے نام سی یاسیت نے اسے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ کام کو انجوائے کر کے کرتی تھی مگر آج کل کام اسے بوجھ لگنے لگا تھا۔

ان کے دورے کے آخری روز اسفندیار نے ان لوگوں کے اعزاز میں اپنے گھر پر ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں ہاسپٹل کے سینئر اسٹاف اور تمام ڈاکٹرز کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ وہ پچھلی بار کی طرح بطور خاص انوینیشن کی منتظر

نہیں تھی۔ سب کو کہا مطلب وہ بھی سب میں ہی شامل ہے۔ اس کا ارادہ تھا جانے کا "خوامخواہ اپنا دل جلانے کا فائدہ اس شخص سے یہ امید کی ہی نہیں جاسکتی تھی کہ وہ اس قسم کی اخلاقیات نبھا سکے۔ مگر حیرت کا جھٹکا تو اسے تب لگا جب اسفندیار خود اس کے کمرے میں آیا اور رات میں ہونے والی دعوت کا بلاوا دیا۔ وہ احمقوں کی طرح منہ پھاڑے اسے نبیل کے سامنے کھڑا دیکھ رہی تھی۔

"سنا ہے میرے گھر آنے کے لیے آپ میری ہی طرف سے انویٹیشن چاہتی ہیں۔ میرے علاوہ کوئی اور چاہے وہ بی بی جان ہی کیوں نہ ہوں بلائے تو آپ اچانک بیمار پڑ جاتی ہیں۔"

وہ بہت سنجیدگی سے یہ بات اس طرح بولا تھا جیسے کوئی پروفیشنل بات کر رہا ہو۔ مگر آنکھوں سے جھانکتی استہزائیہ مسکراہٹ اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ پائی تھی۔ وہ چپ چاپ دیکھتی ہی رہ گئی تھی اور وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔

وہ ڈاکٹر تاجدار اور مسز رضیہ کے ساتھ اس کے گھر آئی تھی۔ سب سے سلام دعا کر کے وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔ اسفندیار' ڈاکٹر ہیلینا اور ڈاکٹر کرسٹوفر کے ساتھ کھڑا اپنی اسٹوڈنٹ لائف کی باتیں کر رہا تھا۔ ڈاکٹر شنوور بھی ان لوگوں کے پاس ہی کھڑے تھے۔ وہ لوگ بڑے مزے لے لے کر تب کی باتیں یاد کر رہے تھے جب ڈاکٹر شنوور ان کے سخت گیر پروفیسر تھے۔

"ہم لوگ سمجھتے تھے کہ پاکستانی ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر شنوور' اسفندیار کو فیور کرتے ہیں' اسی لیے اس کے نمبر ہمیشہ سب سے زیادہ آتے ہیں۔" ڈاکٹر کرسٹوفر شاب کو ہنستے ہوئے یہ بات بتا رہے تھے۔ وہ ابھی ابھی ان لوگوں کے پاس جا کر کھڑا ہوا تھا۔

"اصل میں ہم لوگ اس سے جیلس ہوتے تھے' اسی لیے اس قسم کا پروپیگنڈا کیا کرتے تھے۔" اس کے صاف گوئی سے اس بات کا اعتراف کرنے پر وہاں سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔ وہ پلیٹ ہاتھ میں لیے بے دلی سے کھانا کھا رہی تھی۔

"آپ بہت خاموش ہیں۔ لگتا ہے بور ہو رہی ہیں۔" وہ اچانک اس کے پاس آ گیا تھا۔ شاید آدابِ میزبانی نبھانے کی خاطر۔

"نہیں میں بور تو نہیں ہو رہی۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔ وہ بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کچھ پریشان ہیں؟" بہت سنجیدگی سے پوچھی گئی اس بات پر وہ بے اختیار چونک گئی تھی۔ وہ ایک دم کچھ الجھ سی گئی تھی۔ ابھی وہ جواب میں کچھ بول بھی نہیں پائی تھی کہ ڈاکٹر آصفہ بھی وہیں آ گئیں اور بی بی جان کے پکوائے کھانوں کی تعریفیں شروع کر دیں۔ گفتگو کا رخ خود بخود تبدیل ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد دوبارہ رومیں بحال ہو گیا تھا مگر وہ پھر بھی الجھی ہوئی سی تھی کوئی بات تھی جو اسے مسلسل ڈسٹرب کر رہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

صبح وہ ہاسپٹل صحیح وقت پر پہنچنے کی دھن میں تیز رفتاری سے چلتی ہوئی ہاسٹل سے نکلی تھی۔ تیزی سے پارک میں سے گزرتی ہوئی وہ جیسے ہی داخلی دروازے کے آگے بنے زینے پر چڑھی' پتا نہیں کس چیز سے اسے ٹھوکر لگی اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائی۔ ایک دو منٹ تو وہ سر پکڑ کر اپنی چوٹ میں ہی سہلاتی رہی تھی۔ ایک دم اس کی نظر اپنے ہاتھ سے بہتے خون پر پڑی تو وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کشمالہ کی بڑے پیار سے پہنائی ہوئی چوڑیاں اس وقت اسے خاصا زخمی کر گئی تھیں۔ "اس کا دل نہ ٹوٹ جائے" یہ سوچ کر اس نے چوڑیاں پہن لی تھیں اور اب تقریباً" وہ ساری کی ساری اور کر ٹوٹی ہوئی پڑی تھیں۔ کلائی میں سے بہتا خون دیکھ کر اسے ڈر لگا کہ کہیں کانچ اندر نہ گھس گیا ہو' جلدی سے کپڑے جھاڑتی ہوئی وہ کھڑی ہوئی۔

کوریڈور میں ڈاکٹر شنوور' اسفندیار اور دو انجان صورت بندے کھڑے نظر آئے تھے' جس طرح وہ لوگ دیواروں' چھتوں اور ستونوں کو دیکھتے ہوئے باتیں کر رہے تھے اس سے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ آرکیٹیکٹ سول انجینئرز ہیں۔ اس نے بے خیالی میں اپنا خون نکلتا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے پکڑا ہوا تھا اور اسی طرح ہاتھ پکڑے پکڑے ہی وہ ان لوگوں کو سلام کرتی پاس سے گزر گئی تھی۔ ڈاکٹر شنوور تو باتوں میں اتنے مگن تھے کہ انہوں نے سلام کا جواب بھی سرسری انداز میں دیا تھا مگر اسفندیار کی نظر اس کے ہاتھ پر پڑ گئی تھی۔

"معاف کیجیے گا' میں ابھی آتا ہوں۔" وہ ان لوگوں سے معذرت کرتا ہوا اس کے پیچھے گیا۔ وہ جلدی جلدی

فرسٹ ایڈ کا سازو سامان جمع کر رہی تھی تاکہ اپنی بینڈیج کر سکے۔

"کیا ہوا ہاتھ میں؟" اسے کمرے میں آتا دیکھ کر اس نے ایک دم ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"ادھر آئیے۔ مجھے دکھائیں کیا ہوا ہے۔" وہ نبیل کے آگے سے کرسی کھینچتا ہوا اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بیٹھ چکا تھا۔ کچھ شرمندگی کے عالم میں چلتی ہوئی وہ اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کہاں سے چوٹ لگی؟" خون آلود کلائی کو بڑی فکر مندی سے پکڑ کر دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"پیر سلپ ہو گیا تھا سیڑھیوں پر۔" وہ اس کے جواب پر توجہ دیے بغیر کاٹن سے زخم صاف کرنے کے بعد اب فورسیپ سے چبھے ہوئے کانچ نکال رہا تھا۔ تکلیف کی شدت سے آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ دانت پر دانت جمائے وہ تکلیف برداشت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"شکر ہے۔ زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔" وہ اینٹی سیپٹک کریم لگاتا ہوا بولا۔ اس نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا تو ایک نظر اس کی طرف دیکھا گیا۔

"بہت تکلیف ہو رہی ہے؟" اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس نے آہستگی سے پوچھا تو اس نے تکلیف کی شدت کے باوجود نفی میں سر ہلا دیا اور وہ اس کے اس طرح سر ہلانے پر ہنس پڑا۔

"کبھی کبھار ڈاکٹرز کو خود بھی ایسے تجربات سے گزرنا چاہیے تاکہ مریضوں کی تکلیف کا اندازہ زیادہ اچھی طرح کر سکیں۔" بینڈیج کرتے ہوئے وہ دوبارہ بولا۔ اس کے اس طرح آ جانے پر اسے سخت حیرت ہو رہی تھی' آنکھوں میں استعجاب لیے وہ اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہ بینڈیج کر کے فارغ ہوا تو سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

"اور تو کہیں چوٹ نہیں لگی؟" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اور یہ آپ اتنی ویک کیوں ہو رہی ہیں؟ لگتا ہے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔" اس کی آنکھ پکڑ کر دیکھتے ہوئے خالص ڈاکٹری لہجے میں کہا گیا تھا۔

"کہیں وہ ڈائٹنگ ٹائپ کی خرافات میں تو مبتلا نہیں ہو گئیں۔" سخت گیر انداز میں بازپرس کی جا رہی تھی' اس کے سخت لہجے سے خائف ہوتی وہ ڈرتے انداز میں "نہیں" بولی تھی۔

"ناشتا کیا تھا؟"

"کیا لیا تھا ناشتے میں؟" اس کے گردن ہلانے پر مزید پوچھا گیا۔ اب اگر وہ سچ بول دیتی تو مزید شامت پکی تھی' ناشتے کے نام پر ایک کپ چائے کا پینے پر تو جو کچھ نہ سننا پڑتا کم تھا۔ مگر وہ اس کے جھوٹ بولنے سے پہلے ہی بول پڑا تھا۔

"ایک ڈاکٹر کو اگر بیلینسڈ ڈائٹ کے بارے میں سمجھانا پڑے تو اس سے زیادہ افسوس کا مقام کیا ہو سکتا ہے۔ پڑھے لکھے جاہل غالباً' ایسے ہی ہوتے ہیں۔" اس کے کچھ کہے بغیر پتا نہیں اسے کیسے پتا چل گیا تھا کہ وہ کچھ خاص ناشتا نہیں کر کے آئی۔

"کیا خانساماں کھانا اچھا نہیں پکاتا؟" لہجے میں سختی تھوڑی سی کم ہوئی تھی۔

"نہیں' کھانا اچھا ہوتا ہے۔" وہ اس ڈر سے کہ کہیں بے چارے خانساماں کی بلاوجہ کھنچائی نہ ہو جائے جلدی سے سر اٹھا کر بولی تھی۔

"اگر اس کی بنائی ہوئی چیزیں اچھی نہیں لگتیں تو اپنی مرضی سے کہہ کر الگ سے کچھ بنوا لیا کریں' اپنے ٹیسٹ کے حساب سے' اسے سمجھا دیں کہ آپ کو کس طرح کی ڈشز پسند ہیں۔"

وہ اس کے اتنا زیادہ اور مستقل بولے چلے جانے پر جتنا حیران ہوتی کم تھا' بینڈیج ہونے کے اتنی دیر بعد بھی اس نے ابھی تک اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا' اسے عجیب سی گھبراہٹ محسوس ہوئی تھی' اس کی باتیں اسے بری طرح نروس کر رہی تھیں' گھبراہٹ میں اس نے اپنا ہاتھ کھینچا جسے اس نے فوراً' چھوڑ دیا۔

"اب آپ جا کر آرام کیجیے' لیکن آرام سے پہلے کچھ کھا ضرور لیجیے گا۔" وہ اس فراخدلانہ پیشکش پر بوکھلا گئی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں بالکل۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے محتاط انداز میں بولی تھی۔

"آپ کو یہ شو کرنے کا بہت شوق ہے کہ سارے ہاسپٹل کا بوجھ آپ نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے اور ہم سب اتنے ظالم ہیں کہ بیماری میں یا کسی تکلیف میں

بھی آپ سے کام لیے جاتے ہیں۔" وہ ایک بار پھر تیز لہجے میں بولا تھا۔

"یا اللہ۔ آج انہیں ہوا کیا ہے۔" دل تیز تیز دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔

"جا کر اپنے کمرے میں آرام کریں۔ بیڈ پر لیٹ کر اپنی پسند کا کوئی اچھا سا میوزک سنیں اور آنکھیں بند کر کے کسی ایسی چیز کے بارے میں سوچیں جسے سوچ کر آپ کو خوشی ہوتی ہو۔ یقین کریں' یہ بڑا آزمودہ نسخہ ہے کسی بھی قسم کی ٹینشن یا ڈپریشن سے نجات پانے کا' میں تو جب بھی ڈپریسڈ ہوتا ہوں' یہی کرتا ہوں' آنکھیں بند کیں اور وہ بات سوچنی شروع کر دی جسے سوچنے سے مجھے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ ساری ٹینشن منٹوں میں غائب ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی خواب دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔" وہ بہت غور سے اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس کی چوٹ کا ڈپریشن اور ٹینشن سے کیا تعلق تھا وہ بوکھلا کر سوچ رہی تھی۔

"اور کچھ مہینے پہلے میں نے آپ کو آپ کی جن دو خامیوں کے بارے میں بتایا تھا' ان میں سے چلیں عقل والی بات کو تو جانے دیں' لیکن دوسری بات تو آپ کے اختیار میں ہے آخر آپ ہر وقت اتنا نیگیٹو کیوں سوچتی ہیں۔ زندگی کے روشن پہلوؤں کی طرف نظر ڈالنا سیکھیں' ضروری تو نہیں کہ وہ بات آپ جس طرح سمجھ رہی ہوں وہ ویسی ہی ہو بھی۔"

وہ بہت گمبھیر لہجے میں بولا' جبکہ وہ ایک دم بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی' وہ اسے کیا بات سمجھانا چاہ رہا تھا' وہ کس ڈپریشن' کس ٹینشن اور کس منفی سوچ کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سر پر پاؤں رکھ کر فوراً یہاں سے بھاگ جائے۔

"کہاں رہ گئے اسفند؟" ڈاکٹر شہنور کی آمد اسے کوئی غیبی امداد لگی تھی' اتنی بری طرح نروس وہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی جیسی آج انہیں دیکھ کر' وہ بغیر کسی گھبراہٹ یا ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیے اٹھتا ہوا بولا۔

"ڈاکٹر زوبیہ کے چوٹ لگ گئی تھی' میں وہی دیکھنے آیا تھا۔ چلیں۔"

چوٹ کا لفظ سن کر انہوں نے بغور اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا تھا اور پُرتشویش انداز میں اس سے خیریت دریافت کی تھی' وہ بلاوجہ مسلسل شرمندہ ہوتی چلی جا رہی تھی۔

"نہیں' زیادہ سیریس نہیں ہے' بس معمولی سی۔" وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے جلد سے جلد یہاں سے فرار ہو جانا چاہتی ہو۔ اسفندیار' ڈاکٹر شہنور سے بھی پہلے کمرے سے نکل گیا تھا۔ وہ اپنی دھڑکنوں کو کنٹرول کرتی واپس ہاسٹل میں آ گئی تھی۔ خود کو بیڈ پر گراتے ہوئے اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی تھی۔

"آنکھیں بند کر کے کسی ایسی چیز کے بارے میں سوچیں' جسے سوچ کر آپ کو خوشی ہوتی ہو۔ کبھی کبھی خواب دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔"

اور آنکھیں بند کر کے جو خواب جاگتی آنکھوں سے اس کے سامنے لہرایا تھا' وہ ایسی کوئی بات خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ وہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"یہ سب بالکل غلط ہے' مجھے ایسی فضول اور لغو باتیں سوچتے ہوئے بھی شرم آنی چاہیے۔" وہ خود سے ناراض ہو گئی تھی۔ لیکن وہ ڈاکٹر اسفند' انہیں کیا ہوا تھا آج۔ انہیں کیسے پتا چلا کہ وہ کسی الجھن کا شکار ہے اور کیا وہ' وہ بات جان گئے جو وہ خود سے کہتے بھی ڈرتی تھی۔ اسے خفت' ندامت اور بے تحاشا شرمساری نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اگلے روز ڈاکٹر اسفندیار کا سامنا کرنا اسے دنیا کا سب سے مشکل کام محسوس ہوا تھا۔ وہ ہر اس جگہ سے بچ کر گزر رہی تھی جہاں اس کی موجودگی کا ہلکا سا بھی گمان تھا۔ مگر ایک ہی جگہ رہتے ہوئے سامنا نہ ہو۔ ایسا تو ممکن نہیں تھا۔ وہ ایک بچے کو جو نرس سے دوا کھانے میں ضد کر رہا تھا۔ اسے بہلا پھسلا کر کیپسول کھلانے کی کوشش کر رہی تھی جب اسفندیار اور آرکیٹیکٹ جنرل وارڈ میں داخل ہوئے تھے' اسے نظرانداز کیے وہ ان کے ساتھ وہاں کروائی جانے والی تبدیلیاں ڈسکس کر رہا تھا۔ بچے کو دوا کھلا کر وہ وہاں سے چلی گئی وہ لوگ تب بھی وہیں تھے۔ اس کے بعد بھی ایک دو مرتبہ اس سے سامنا ہوا مگر وہ اپنے سابقہ انداز میں مختصر بات اور سخت انداز لیے ہوئے نظر آیا۔ وہ اس پل پل بدلتے موڈ والے شخص کو سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

ڈاکٹر آصفہ نے ہاسٹل فون کر کے اسے اور ڈاکٹر تاجدار کو اپنے گھر ڈنر کی دعوت دی تھی۔

"حلیم پکا رہی ہوں' تم لوگ بھی آ جاؤ۔"

کوئی ایمرجنسی نہ ہوتی تو وہ دونوں میاں بیوی اتوار کا دن گھر پر آرام کرتے ہوئے گزارنا پسند کرتے تھے۔ وہ لوگ وہاں پہنچے تو ڈاکٹر شباب پہلے سے وہاں موجود تھا۔ ڈاکٹر آصفہ ان لوگوں کی جلدی واپسی کا سوچ کر فوراً کھانا لگوانے لگی تھیں۔ انہیں واپس جا کر ڈیوٹی جوائن کرنی تھی۔ جبکہ ڈاکٹر شہنور اور ڈاکٹر شباب ہنوز بیت بازی میں مصروف تھے۔ دونوں کا شعری ذوق قابل ستائش تھا اور ہاسپٹل میں بھی دونوں ایک دوسرے کو کوئی نئی پڑھی ہوئی نظم یا غزل سناتے پائے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے آنے سے پہلے وہ اسی کام میں منہمک تھے اور اب بھی سلسلہ جاری و ساری تھا۔ اچھے اشعار اسے بھی یاد رہ جاتے تھے اس لیے وہ اس محفل کو انجوائے کر رہی تھی جبکہ ڈاکٹر تاجدار صرف یا ہو اور مکرر ارشاد کہہ کر ان دونوں کو بک اپ کر رہا تھا ورنہ شعروں ویروں میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ابھی وہ یہ بات سوچ ہی رہی تھی کہ انہوں نے سب کو انوائٹ کیا اور اسفندیار کو نہیں بلایا۔

اسی وقت گیٹ پر بیل ہوئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ لاؤنج میں موجود تھا۔

"ایک جگہ ضروری کام سے جانا تھا مگر آپ کا میسج ملا تو فوراً آ گیا۔" وہ ڈاکٹر آصفہ سے مخاطب تھا۔

"بس آپ ہار مان جائیے۔ ڈاکٹر شباب "ر" سے اب آپ کو مزید کوئی بھی شعر یاد نہیں آ سکتا۔" بیت بازی کرتے وقت وہ لوگ جیسے ہی اندازہ لگاتے کہ مخالف پارٹی کے پاس فلاں حرف سے شروع والے اشعار کی کمی ہے' کوشش کرتے کہ زیادہ سے زیادہ اسی پر ختم ہونے والے شعر سنائے جائیں۔

ڈاکٹر شباب ہار ماننے والی بات نظرانداز کر کے مسلسل سوچے جا رہا تھا۔ مگر آثار بتا رہے تھے کہ ہمارا اسٹاک ختم ہو چکا ہے "ر" کا۔

رنگ پیراہن کا' خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسفندیار نے شباب کی مشکل حل کر دی تھی۔

"ارے آپ کی یہ خوبی تو آج پتا چلی کہ آپ لٹریچر میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔"

ڈاکٹر شباب خوشی کے ساتھ ساتھ حیران بھی ہوا تھا۔ وہ جواباً مسکرا دیا تھا۔ ڈاکٹر شہنور اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ "آپ کو میرا شعر سنانا فاؤل لگ رہا ہے تو میں اسے واپس لے لیتا ہوں۔" وہ ان کی نظریں محسوس کر کے فوراً بولا تھا۔

"نہیں بھئی' ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ خوش دلی سے مسکراتے ہوئے گویا ہوئے تھے۔ اسی وقت ڈاکٹر آصفہ نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی تو وہ سب ڈائننگ روم میں آ گئے۔ کھانے کے دوران بھی ان لوگوں کی شعر و شاعری جاری تھی۔ باقی تمام لوگ کھانے سے انصاف کرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کو داد بھی دیتے جا رہے تھے۔

وہ لڑکی اچھی لڑکی ہے' تم نام نہ لو ہم جان گئے
وہ جس کے لانبے گیسو ہیں' پہچان گئے' پہچان گئے

ڈاکٹر شہنور نے شعر سنانے کے ساتھ ساتھ جس طرح اس کی طرف دیکھا تھا وہ نظریں اسے حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھیں۔ اسے دیکھنے کے بعد وہ اسفندیار سے اپنے شعر کی داد طلب کرنے لگے۔

"کیسا؟"

"بہت اچھا۔" وہ تعریف کرتا ہوا بولا۔

"اچھا نہیں' اچھی۔" ڈاکٹر شہنور نے اسے ٹوکا تھا۔

"لیکن آپ تو شعر کی بات کر رہے ہیں۔" وہ پُراعتماد انداز میں مسکراتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

"یہ آپ لوگوں نے کوڈ ورڈز میں باتیں کیوں شروع کر دیں' یہ اچھا' اچھی کیا ہے؟" ڈاکٹر آصفہ نے مداخلت کی تھی۔

"کچھ نہیں' یہ ذرا ہمارے آپس کی خاصی کونفیڈینشل قسم کی بات ہے۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے بولے تھے۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر اسفندیار کی طرف دیکھا تو وہ بہت سکون سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ ڈاکٹر شباب جوابی شعر سنانے لگا تھا اور باقی افراد بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے' اس کے دیکھنے پر اسفندیار نے بھی اس کی طرف دیکھا تھا' ہمیشہ سنجیدہ تاثرات والے چہرے پر بڑی دلفریب مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی' آنکھوں سے جھانکتی شرارت اور شوخ

کی چمک وہ صرف ایک پل کے لیے اس کی سمت دیکھ پائی تھی۔

"کیا ہوا زوبیہ! تم تو کچھ لے ہی نہیں رہیں۔" ڈاکٹر آصف نے ڈش اس کی طرف سرکاتے ہوئے خالی پلیٹ دیکھ کر ٹوکا تھا۔

"میں لے چکی' بہت مزے دار حلیم بنائی ہے آپ نے۔" یہ مختصر سا فقرہ اس وقت وہ کتنی دقتوں سے بول پائی تھی اس کا دل جانتا تھا۔ اپنا احمقانہ انداز میں سر جھکانا اور اسفندیار سے نظریں چرانا اسے جتنا بھی برا لگ رہا ہو مگر اس وقت وہ خود کو اس کیفیت سے نکال نہیں پا رہی تھی۔ سر جھکائے ہوئے بھی وہ محسوس کر سکتی تھی کہ بظاہر سب کے ساتھ باتیں کرنے کے باوجود وہ مسلسل اسے فوکس کیے ہوئے ہے اور اس کے چہرے پر بکھرے رنگوں اور گھبرائے ہوئے انداز کو انجوائے کر رہا ہے۔ کھانا کھاتے ہی اسفندیار فوراً" چلا گیا تھا۔ وہ اور تاجدار ابھی قہوہ پیتے ہی اٹھ گئے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥
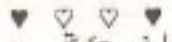
کہیں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ دونوں کے رویوں میں کوئی تغیر نہیں آیا تھا مگر پھر بھی ایک ان کہی سی بات تو درمیان میں تھی ہی جو اگر اسے مسرت بخش رہی تھی تو خوش تو وہ بھی تھا۔ بظاہر معمول کے انداز میں کام کرتا' روٹین نبھاتا مگر دل جو خوش گمانیوں کے حصار میں آ چکا تھا' وہ عام سی بات میں سے بھی خاص معنی نکالتا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥
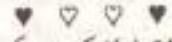
خجستہ اپنا معمول کا چیک اپ کروانے آئی تھی۔

"یہ جوڑا مجھے شہباز نے لا کر دیا ہے' شہر گیا تھا کام سے۔ میرے لیے یہ جوڑا اور چوڑیاں لایا ہے۔"

اس نے خوشی خوشی اپنے سرخ رنگ کے ریشمی سوٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔ عام گاؤں' دیہات کی لڑکیوں کی طرح وہ بھی سلکی کپڑوں کو بہت قیمتی اور کاٹن کو بہت سستا کپڑا سمجھتی تھی۔ اسے خجستہ کی معصومیت پر پیار آیا تھا۔ اگر وہ کراچی' اسلام آباد اور لاہور کی مختلف بوتیکس میں سے لڑکیوں کو کاٹن کے سوٹ آٹھ آٹھ دس دس ہزار میں خریدتے دیکھ لے تو شاید پاگل سمجھے گی۔ وہ اپنے نئے سوٹ اور چوڑیوں پر بے حد خوش نظر آ رہی تھی' زوبیہ اس کا خوشی سے دمکتا چہرہ دیکھ کر خود بھی مسکرا رہی تھی۔

"میں اچھی لگ رہی ہوں ناں؟" اس نے بچگانہ انداز میں پوچھا تو وہ کھل کر ہنس پڑی تھی۔

"بہت پیاری' بالکل نازک سی گڑیا لگ رہی ہو۔" اس نے سچے دل سے تعریف کی تھی۔ وہ شادی شدہ تھی' ایک بچے کی ماں بننے جا رہی تھی مگر تھی تو کم عمر لڑکی' اسے اس کی خوشی بڑی فطری لگی۔ اس کی خوب تعریفیں کرنے کے بعد وہ اس سے بہادر کے سلوک کے بارے میں پوچھنے لگی تھی۔

"آپ کی وجہ سے میرا اتنا بھلا تو ہو گیا ہے کہ اب اگر وہ مارتا ہے تو اماں بچانے آ جاتی ہے' شہباز تو پہلے ہی میرے ساتھ اچھی طرح بولتا تھا' اب اماں بھی خیال رکھنے لگی ہے۔ میرے لیے یہ بھی بہت ہے۔ اماں کہہ رہی تھی کہ جب تو ماں بنے گی' وہ بھی ایک بیٹے کی تو بہادر بھی بدل جائے گا۔" وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی تھی۔

"آپ دعا کریں' اللہ مجھے بیٹا دے دے۔" چلتے وقت وہ اس کے ہاتھ تھام کر بولی تھی۔

"ہاں میں تمہارے لیے دعا کروں گی خجستہ! لیکن بیٹیاں بھی تو بہت پیاری ہوتی ہیں۔" اس نے اسے سمجھانا چاہا۔

"نہیں' مجھے بیٹا چاہیے۔ بیٹی ہوئی تو میری طرح خاوند کے جوتے کھائے گی۔ پیٹ بھر کر روٹی ملے نہ ملے' مگر خاوند کی مار صبح شام خوب پیٹ بھر کر کھانے کو ملے گی۔" وہ بڑے ضدی اور ناراض انداز میں بولی تو وہ خاموش ہو گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥
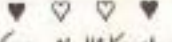
بہت دنوں سے اس کا خالہ امی سے کوئی رابطہ نہ ہو سکا تھا۔ پیسے وہ پابندی سے بھیج رہی تھی مگر وہاں سے نہ کوئی خط نہ فون۔ اس سے پہلے دو مرتبہ وہاں فون کرنے پر بھی اس کی خالہ امی سے بات نہ ہو سکی تھی۔ اس نے انہیں فون کرنے کا سوچا۔ مگر فون کرنے پر جو اطلاع اسے ملی' وہ اس کے حواس درہم برہم کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ کتنی دیر تک سکتے کی کیفیت میں سر تھامے بیٹھی رہی تھی۔

وہ عورتوں کے وارڈ سے ہو کر واپس آ رہی تھی جب اسے کوریڈور میں پیرا میڈیکل اسٹاف کے چار پانچ افراد کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر آصف بھی ایک اسٹریچر کے پاس کھڑے

نظر آئیں۔ ان لوگوں کو اس طرح جمگھٹا لگائے دیکھ کر تو اسے کوئی تعجب نہیں ہوا تھا۔ مگر ذرا قریب آنے پر جب اسے کونے میں کھڑے چند علاقائی لوگوں کے ساتھ ساتھ شہباز بھی کھڑا نظر آیا تو وہ بری طرح چونکی تھی۔ اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔ اس کا وجدان کسی خطرے کی نشان دہی کر رہا تھا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے چلتی ہوئی ان لوگوں کے پاس آئی تھی۔

"کیا ہوا ڈاکٹر آصف؟" سراسیمگی کے عالم میں اس نے پوچھا تھا۔ مگر ان کے جواب دینے سے پہلے ہی اس کی نظر اسٹریچر پر پڑے وجود پر پڑ چکی تھی۔

"خجستہ!" وہ چلائی تھی۔ "کیا ہوا اسے؟" خون میں لت پت بے ہوش خجستہ وہ لڑکی لگ ہی نہیں رہی تھی جو دوپہر میں اسے خوشی خوشی اپنا سرخ جوڑا اور سبز سرخ چوڑیاں دکھا رہی تھی۔ کپڑے تو اب بھی اس کے تن پر وہی تھے مگر کس حال میں۔

"اس کے پیٹ میں گولی لگی ہے۔" ڈاکٹر آصف نے اس کی کیفیت دیکھتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے بتایا تھا۔

"گولی؟" اس کا دل اندر ہی اندر ڈوبا تھا۔ "کیسے؟ کس نے ماری اسے گولی؟" وہ اس کی نبضیں چیک کرتے ہوئے ہذیانی انداز میں چیخی تھی۔ "اور آپ نے اسے یہاں کیوں رکھا ہوا ہے۔ جلدی کریں' آپریٹ کریں' گولی نکالیں۔"

"خجستہ! آنکھیں کھولو' دیکھو میں تمہارے پاس ہوں' میں تمہیں بچا لوں گی' تمہیں زندہ رہنا ہے خجستہ' ہمت سے کام لو۔"

سب لوگ اسے چیختے چلاتے تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر شہنور کو وارڈ بوائے بلا کر لایا تھا جبکہ اسفندیار کو تو ڈاکٹر آصف نے خود فون کر کے فوراً" آنے کے لیے کہا تھا۔

"ہٹیں ایک طرف۔" ڈاکٹر شہنور نے ارد گرد کھڑے لوگوں کو ہٹایا تھا' سخت ترین بے بسی کے عالم میں اس کی نظر سامنے سے تیز تیز قدم اٹھا کر اس طرف آتے اسفندیار پر پڑی تو وہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی تھی۔

"خجستہ کو بچا لیں پلیز۔" وہ التجائیہ انداز میں اس کا بازو پکڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

وہ بے لچک اور مضبوط انداز میں بولتا' آپریشن کی تیاری کا حکم دیتا' خود بھی فوراً" وہاں سے چلا گیا تھا۔ اسٹریچر آپریشن تھیٹر کی طرف لے جایا جا رہا تھا اور وہ بھی پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے آپریشن تھیٹر میں داخل ہو گئی تھی۔

وہ تینوں مخصوص گاؤنز' گلوز وغیرہ پہن کر آپریشن شروع کرنے والے تھے' ارد گرد نرسیں اور دوسرا اسٹاف بھی کھڑا ہوا تھا۔ اس کے لب تیزی سے مختلف دعاؤں کا ورد کر رہے تھے' ہر وہ دعا جو اسے یاد آ رہی تھی وہ اسے پڑھ رہی تھی۔

تیزی سے حرکت کرتے ڈاکٹر شہنور اور اسفندیار کے ہاتھ اچانک رک گئے تھے۔ ڈاکٹر آصف نے ایک دکھ بھری نگاہ خجستہ پر ڈالی تھی اور ہاتھ لٹکا کر یوں کھڑی ہو گئی تھیں جیسے اب کرنے کے لیے کچھ نہیں بچا۔ ڈاکٹر شہنور آہستہ آواز میں شاید اسفندیار سے بولے تھے۔

"گولی جس اینگل سے لگی اور پھر جتنا زیادہ خون بہہ گیا تھا' اتنی دیر بھی یہ زندہ رہ لی' یہ معجزہ ہی ہے ورنہ تو موقع پر ہی موت ہو جانی چاہیے تھی۔"

اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ "موت؟" ڈاکٹر آصف اس کی طرف بڑھ رہی تھیں' ابھی وہ اس کے پاس آ کر کہیں گی کہ خجستہ مر گئی' وہ یہ بات کیسے سن پائے گی۔ انہیں اپنے پاس آتا دیکھ کر وہ بے اختیار بھاگتی ہوئی دروازے کی طرف گئی تھی۔

وہ سب کے درمیان سے راستہ بناتی لوگوں کو چیرتی اندھا دھند وہاں سے بھاگ رہی تھی۔ کسی ایسی جگہ جہاں کوئی اسے آ کر یہ نہ بتا سکے کہ خجستہ مر گئی' وہ مر سکتی ہے بھلا۔ یونہی بے دھیانی میں بھاگتے پتا نہیں اسے کس چیز سے ٹھوکر لگی تھی اور وہ فرش پر گر پڑی تھی۔

"زوبیہ!" کوئی اسے آوازیں دے رہا تھا' پتا نہیں کتنی دیر سے وہ یونہی کوریڈور کے فرش پر اپنا سر گھٹنوں میں چھپائے بیٹھی تھی۔

"زوبیہ! میرے بچے صبر کرو' اسے اسی طرح چلے جانا تھا' ہم سب کو بھی تو چلے جانا ہے' جلد یا بدیر مگر جانا تو سب کو ہے۔"

ڈاکٹر شہنور اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بڑی دلسوزی اور اپنائیت سے سمجھا رہے تھے۔ منجمد

آنکھوں سے وہ ان کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

ان لوگوں کے پاس سے اسٹریچر پر سفید چادر سے ڈھکا ہوا ایک وجود گزرا تو اس نے اپنی آنکھیں مضبوطی سے بند کر لی تھیں۔

"میں نے آپ سے کہا تھا نا میں ایسی جگہ چلی جاؤں گی جہاں بھی کوئی مجھ پر ظلم نہیں کر سکے گا۔ دیکھیں میں جا رہی ہوں۔" اس وجود میں سے آواز آئی تھی۔

"خجستہ، رک جاؤ میری بات سنو۔" وہ اس کے پیچھے بھاگنا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر شنور نے اسے مضبوطی سے ہاتھ پکڑ کر روک لیا تھا۔ اگلے لمحے وہ ان کے سینے پر سر رکھے دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

"صبر کرو بیٹا!" وہ اس کا سر تھپک رہے تھے۔

"آپ کچھ نہیں جانتے ڈاکٹر شنور! آپ کچھ بھی نہیں، وہ میرے لیے کیا تھی۔ میں اسے زندگی سے پیار کرنا سکھا رہی تھی۔ اسے اس کی کھوئی ہنسی لوٹانے کی کوشش کر رہی تھی مگر سب ختم ہو گیا۔"

اسے نہیں پتا تھا کون اسے دیکھ رہا ہے۔ کون وہاں ہے، کون نہیں۔ اسے بس خود اپنی ہی چیخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"زوبیا! تمہیں وہاں جانا ہے۔ کیا آخری بار اسے نہیں دیکھو گی۔" ڈاکٹر آصفہ بیڈ پر اس کے سرہانے بیٹھی مسلسل اسے سمجھا رہی تھیں۔ وہ کسی سے کچھ نہیں بول رہی تھی۔ بس آنسو تھے جو متواتر بہے چلے جا رہے تھے۔

چارپائی پر بے جان پڑے اس جسم کو کل اس نے سرخ لبادے میں ہنستے کھلکھلاتے دیکھا تھا۔

"گولی مارتے ہی بھاگ گیا تھا بہادر، پتا نہیں کہاں سے اس کے دوست اسے واپس بلا کر لائے ہیں کہ اگر بھاگے گا تو قتل کا الزام ثابت ہو جائے گا۔ پولیس سے تو یہ کہا ہے کہ پستول کی صفائی کر رہا تھا، غلطی سے پستول چل گیا اور گولی سامنے بیٹھی خجستہ کو لگ گئی۔ ویسے لگتا ہے چکر کچھ اور ہی ہے، شاید اس کا شہباز سے کچھ چکر تھا اور یہ بات بہادر کو پتا چل گئی تھی۔"

میت کے پاس بیٹھی ایک عورت دوسری سے سرگوشی میں بات کر رہی تھی۔

"بند کرو بکواس۔" وہ ان عورتوں پر چلائی تو آس پاس بیٹھے تمام لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر آصفہ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر کسی جارحانہ عمل سے روکا تھا۔

"اگر وہ جہالت کی وجہ سے الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہیں تو تم تو سمجھ داری سے کام لو۔" انہوں نے اسے ٹوکا تھا۔

اس کی ماں باپ، بہن بھائی آنسو بہا رہے تھے، اس کا دل چاہا کہ اس کے باپ کو وہاں سے دھکے دے کر نکال دے اور کہے کہ "تمہیں اس کی موت پر ایک آنسو بہانے کا بھی حق نہیں۔ صرف دس ہزار روپوں کے لیے تم نے بیٹی ایک ظالم کو سونپی تھی، اب نسوے بہا کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔"

بہادر پولیس کی تحویل میں تھا، پولیس اس کا بیان، ڈاکٹری رپورٹ اور اس وقت گھر پر موجود لوگوں کے بیان قلم بند کر رہی تھی۔

"مجھے کیا پتا تھا میرا لاڈلا ہوا یہ جوڑا اس کی موت کا سبب بن جائے گا۔" وہ اس کے کردار پر شک کرتا تھا، ہم لوگ اچھی طرح بولتے تو اسے غصہ چڑھتا تھا۔ اسے اپنی زیادہ عمر کا بہت احساس تھا اسی لیے خجستہ کو دبا کر رکھتا تھا۔ لیکن وہ یہ سب کر جائے گا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر پتا ہوتا تو کبھی اس کے لیے کوئی تحفہ نہ لاتا۔ بس اس کے نئے کپڑے دیکھ کر اسے آگ لگ گئی تھی، مجھ سے بھی لڑا تھا کہ میں اپنی بھابی پر بری نظر رکھتا ہوں، بات بڑھتے بڑھتے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ خجستہ بھی بیچ میں بولنے لگی تھی۔ میں اور اماں تو دیکھتے ہی رہ گئے اور بہادر نے نیفے میں اڑسی ہوئی ریوالور نکال کر اس پر فائر کر دیا۔

شہباز سرگوشی نما آواز میں آہستہ آہستہ کل کا سارا واقعہ سنا رہا تھا اسے اور ڈاکٹر آصفہ کو۔

"کاش میں نے اسے اپنے پاس روک لیا ہوتا۔ بس چار گھنٹے اور اسے اپنے پاس روکے رکھتی۔ وہ گھڑی ٹل جاتی تو اسے واپس گھر بھجوا دیتی۔ لیکن نہیں اسے واپس ہی نہ بھجواتی اپنے پاس ہی رکھ لیتی اسے وہاں کبھی بھی نہیں جانے دیتی۔" وہ خود سے کہہ رہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس کے اندر زندہ رہنے کی خواہش ہی دم توڑ گئی تھی۔

اس روز کے بعد اس نے خجستہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ اندر ہی اندر وہ خود بھی ختم ہو رہی تھی۔ اب زندگی میں کبھی کوئی روشن کل نہیں آئے گا۔ اب زندگی بھی کوئی مدھر گیت نہیں گائے گی۔ چوتھے روز وہ خود کو زبردستی گھسیٹ کر ہاسپٹل لے آئی تھی۔

کسی نے براہ راست اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی مگر سب اسے ترحم بھری نگاہوں سے دیکھ ضرور رہے تھے۔ آج بچوں کو کہانیاں سناتے ہوئے اس کا دل چاہ رہا تھا ہر کہانی کا اختتام تبدیل کر دے۔

"پھر سنڈریلا آخر میں اکیلی رہ جاتی ہے۔ کوئی شہزادہ اسے لینے نہیں آتا۔"

"سنو وہائٹ زہریلا سیب کھا کر مر جاتی ہے پھر شہزادے کے جگانے پر بھی نہیں اٹھتی۔"

"بچے اس جادوگرنی کے مکان پر پہنچتے ہیں جس پر بڑے بڑے کیک، چاکلیٹس اور خوب ساری آئس کریمز لگی ہوتی ہیں تو جادوگرنی انہیں اندر بلا کر کھولتے تیل والی کڑاھی میں ڈال دیتی ہے اور وہ دونوں بہن بھائی جل کر مر جاتے ہیں۔"

"ہاں یہی زندگی کی سچائی ہے۔ زندگی بہت بے رحم اور ظالم ہے، اس سے خوش امیدی وابستہ کرنا بے کار ہے۔" وہ ست قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی، جب چوکیدار اسے ڈھونڈتا ہوا اسی طرف آیا تھا۔

"آپ کو ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔" وہ مردہ قدموں سے چلتی چوکیدار کے پیچھے پیچھے گیٹ تک آ گئی تھی۔ اسفندیار جیپ میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"بیٹھیں۔" اسے دیکھ کر دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ عام سے انداز میں بولا تھا۔

"کہاں جانا ہے؟" اس نے بے دلی سے پوچھا تھا۔

"ایک ضروری کام سے جانا ہے، آپ جلدی سے بیٹھیں۔"

وہ اگنیشن میں چابی گھماتا ہوا اس کی طرف دیکھے بغیر گویا ہوا تھا۔ وہ مزید سوال جواب کیے بغیر خاموشی سے جیپ میں بیٹھ گئی تھی۔

"کوئی پوچھے تو کہنا کسی ضروری کام سے گئے ہیں۔ واپسی ذرا دیر سے ہو گی۔" وہ گاڑی فرسٹ گیئر میں ڈالتے ہوئے چوکیدار سے بولا تھا۔ خاموشی سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے ایک دفعہ بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس نے دو ایک بار الجھی ہوئی نظریں اس پر ڈالی تھیں۔ آخر وہ اسے کہاں لے جا رہا تھا۔

ایک گھنٹے کی اس تیز ترین ڈرائیو کے بعد اس نے جیپ درختوں کے جھنڈ کے نیچے روکتے ہوئے اسے اترنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اتر تو آئی تھی مگر اب حیرت سے اس ویران جگہ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھا تو وہ بھی اس کے پیچھے چلنے لگی تھی۔ سامنے بہتی جھیل کے پانی اور ہوا سے ہلتے درختوں کے پتوں کے سوا وہاں دور دور تک کوئی آواز نہیں تھی۔ جھیل کے کنارے پیچ کردہ درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ گیا تھا اسے بھی اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا گیا تھا، وہ بے دلی سے اس سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گئی تھی۔

کچھ دیر وہ یوں ہی پاس پڑے چھوٹے چھوٹے پتھر پانی میں اچھالتا اور بھنور بنتے دیکھتا رہا۔

"کیا بات ہوئی ہے زوبیہ؟" اس نے اچانک اس کی طرف رخ کر کے سوال کیا تھا۔ وہ حیرت سے اس کے

سوال میں چھپے معنی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔
"خجستہ کے مرنے کے علاوہ کوئی بات ہوئی ہے۔ تمہاری بات' تمہاری اپنی زندگی کی کوئی بات۔" وہ اتنے مستحکم انداز میں کہہ رہا تھا کہ وہ ھک سے رہ گئی تھی۔
"تم مجھے نہیں بتاؤ گی۔ مجھ سے شیئر کرو زوبیہ! کیا ہوا ہے پلیز مجھے بتاؤ" وہ اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ کر بڑے اصرار سے پوچھ رہا تھا۔ وہ جواب میں اس سے کہنا چاہتی تھی۔
"آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میرے ساتھ کچھ نہیں ہوا کوئی پرابلم نہیں ہے میرے ساتھ۔" مگر بجائے یہ کہنے کے اس کے منہ سے ایک بالکل مختلف جملہ نکلا تھا۔
"میری خالہ امی مر گئیں۔" جملہ مکمل کرتے کرتے وہ رو پڑی تھی۔ "جولیا" اس نے ایک گہری سانس لے کر آہستگی سے پوچھا تھا۔
"کب......؟"
"پانچ مہینے ہو گئے' اور مجھے چار روز پہلے پتا چلا کہ مجھ سے تھوڑی بہت مصلحت آمیز ہی سہی محبت کرنے والی واحد ہستی بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔" وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر روتے ہوئے بول رہی تھی۔
اس نے تسلی دینے والے انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا مگر اسے چپ کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔
"میں ہر مہینہ انہیں پیسے بھیجا کرتی تھی۔ کبھی ڈاکٹر تاجدار سے منی آرڈر کروائی' کبھی اسٹاف کے کسی اور بندے سے جان کر تاکہ سب کو پتا رہے کہ میں بے آسرا اور بے ٹھکانا نہیں' پیچھے میرا ایک گھر ہے۔ کچھ لوگ ہیں میرے اپنے جنہیں میری پروا ہے۔ پچھلے پانچ مہینوں سے اسی طرح میرے بھیجے ہوئے پیسے وصول کیے جا رہے تھے۔ خالہ امی پڑھی لکھی نہیں تھیں وہ شمائلہ سے خط لکھوایا کرتی تھیں اس کی شادی کے بعد ان کے خط آنا بند ہو گئے تو میں حیران نہیں ہوئی میں نے اس دوران دو بار فون کیا تو بھائی نے کہا۔ نماز پڑھ رہی ہیں یا بازار گئی ہیں اور میں نے ان کی بات سچ مان لی پھر اس روز جب میں نے فون کیا تو بھائی کے بجائے کسی ملازمہ نے فون اٹھا لیا تھا اور میرے پوچھنے پر مجھے یہ خبر سنائی تھی۔"
وہ زار و قطار روتے ہوئے اسے بتا رہی تھی۔ اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا بلکہ اپنا ہاتھ بھی واپس ہٹا لیا تھا۔ بہت دیر تک روتے روتے وہ خود ہی چپ ہو گئی تھی۔ گھٹنوں پر سے سر اٹھا کر چہرہ دوپٹے سے خشک کرتی وہ اپنے سچ بولنے سے زیادہ اس کے صحیح بات کھوج لینے پر حیران سی بیٹھی تھی۔
"تمہیں حیرت ہو رہی ہے کہ مجھے یہ کیسے پتا چلا' بات یہ ہے زوبیہ خلیل! کہ جن کی ہمیں بہت پروا ہوتی ہے ہم ان کے چہرے پر لکھی ہر تحریر پڑھ لیتے ہیں۔ تم خجستہ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ مجھے پتا ہے مگر اس روز تمہارا وہ ابنارمل رویہ دیکھ کر' مجھے لگا کہ شاید تم پہلے ہی کسی اور صدمے کے زیر اثر ہو اور دوسرا صدمہ تم سہہ نہیں پا رہیں۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ کوئی دو دکھ ہیں جو آپس میں مل گئے ہیں۔ اور جنہوں نے تمہیں اس طرح توڑ پھوڑ دیا ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے رسانیت سے کہہ رہا تھا۔
"ہاں دو دکھ تو ہیں۔ ایک خجستہ کے مرنے کا اور دوسرا زوبیہ خلیل کے مرنے کا۔ اور وہ پہلی بار تو نہیں مری' اس سے پہلے بے شمار مرتبہ مر چکی ہے۔ آپ کو پتا ہے زوبیہ مری' خجستہ کی لاش دفن ہوئی اور اس کی ہر آس' ہر امید' ہر خواہش سب دفن ہو گئیں۔ اب میرا کوئی گھر نہیں میں اکیلی ہوں' میرا کوئی نہیں۔ بالکل تنہا' میں سوچتی تھی کوئی مشکل پڑی' کوئی الجھن آئی تو کم از کم خالہ امی کا گھر تو مجھے ضرور پناہ دے گا۔ وہ گھر مجھ سے چھن گیا۔ 'وہ پناہ گاہ ختم ہو گئی اور مجھے کسی نے بتایا تک نہیں۔ میں اتنی قابل نفرت تھی' اتنی بے کار ہستی تھی کہ مجھے کسی نے اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔" وہ تاحد نگاہ پھیلی ہوئی جھیل پر نظریں مرکوز کیے عجیب سی بے بسی میں گھری بول رہی تھی۔
"تم اکیلی نہیں ہو زوبیہ! میں ہوں تمہارے ساتھ۔" اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے یقین دلایا تھا۔
"آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے ڈاکٹر اسفند! کچھ بھی نہیں' اگر میری سچائی جان لیں تو شاید دوبارہ کبھی پلٹ کر میری طرف دیکھیں گے بھی نہیں۔" وہ بہت بے رحم انداز میں بولی تھی۔
"تمہاری سچائی میرے لیے یہ ہے کہ تم اس دنیا کی سب سے اچھی لڑکی ہو اور اس بات کی گواہی خود میرے

دل نے دی ہے۔ تم کل کیا تھیں' تمہارا کیا ماضی تھا' مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ جب ہم کسی سے محبت کرتے ہیں تو اسے اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کر لیتے ہیں۔ محبت میں سودے بازی نہیں ہوتی۔"
وہ اپنے مخصوص ٹھوس اور دو ٹوک لہجے میں گویا ہوا تھا۔
وہ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اتنا اعتبار' اتنا اندھا بھروسا اس کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔
"آپ صرف پچھلے ڈیڑھ سال سے مجھے جانتے ہیں اور پھر بھی یہ سب کہہ رہے ہیں' آپ کو کیا معلوم میری زندگی کے پچھلے ابواب کتنے سیاہ تھے۔ میں نے آپ لوگوں سے کیا کیا جھوٹ بولے ہیں۔ آپ کو پتا چلے گا تو حیران رہ جائیں گے کہ بظاہر بڑی ایماندار اور سچی نظر آنے والی یہ لڑکی اتنی دھوکے باز اور جھوٹی ہے۔ میں نے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ میرے ماں باپ مر چکے ہیں اور اب ساری دنیا میں ایک سگی خالہ کے علاوہ کوئی نہیں' مگر نہ وہ میری سگی خالہ تھیں اور نہ ہی میں کراچی میں تنہا رہ جانے کی وجہ سے ان کے پاس پشاور گئی تھی۔ کیا آپ بھی سوچ سکتے ہیں کہ کراچی میں میرا ایک گھر ہے۔ جس میں میرے دو بڑے بھائی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں اور وہ گھر وہ ہے جہاں میں پیدا ہوئی' پلی بڑھی' زندگی کے بے شمار سال وہاں گزارے۔ پھر آخر ایسی کیا بات ہوئی جو میں اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر خالہ کے گھر رہنے لگی۔" وہ بہت تلخ انداز میں بڑی بے رحمی سے بول رہی تھی۔
"میں یہ بات بہت پہلے سے جانتا ہوں۔" وہ اتنے اطمینان سے بولا تھا کہ وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔
"تم نے وہ گھر کیوں چھوڑا' میں نہیں جانتا مگر مجھے یہ بات شروع وقت سے جب تم نے جوائن کیا تھا تب سے پتا ہے کہ تمہارے دو بھائی ہیں' کراچی کے بہترین علاقے میں تمہارا گھر ہے۔ تمہارے والد کا اپنا گاڑیوں کا شو روم تھا جسے اب تمہارے دونوں بھائی سنبھالتے ہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سکون سے گویا ہوا تھا۔
"انٹرویو کے وقت جیسے کہ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ تم مجھے بہت پرخلوص لگی تھیں۔ مگر مجھے تمہارا اس سوال پر گڑبڑا جانا کہ تم یہاں جاب کیوں کرنا چاہتی ہو' کھٹکا گیا تھا۔ ایسا لگا تھا جیسے گھبرائے ہوئے انداز میں کچھ چھپانا چاہتی ہو' تمہارے ڈاکومنٹس میں سے تمہارا کراچی کا پتا حاصل کرنا بڑا آسان سا کام تھا۔ میں تمہارے بارے میں درست معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ میں اپنے ہاسپٹل میں اچھے کردار کے حامل لوگوں کو ہی رکھنا چاہتا تھا تمہارے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں وہ تمہارے خلاف جا رہی تھیں۔ ایک لڑکی اپنا شہر اور سگے بھائیوں کو چھوڑ کر کسی رشتے دار کے گھر رہنے لگے اور سب سے اس بات کو چھپائے بھی تو یہ بات ہی مشکوک کر دینے والی ہے۔ مگر پھر بھی میں نے تمہیں اپائنٹ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے زندگی کے اتنے برسوں میں جو تھوڑا بہت لوگوں کو سمجھا تھا اس نے مجھے اتنا اعتماد تو دے ہی دیا کہ تمہارے بارے میں اندازہ غلط ثابت نہیں ہو گا۔"
وہ شروع سے اس کے جھوٹ کو جانتا تھا۔
"اس سے زیادہ تو یقیناً" آپ کچھ نہیں جانتے ہوں گے میرے ماضی کے بارے میں۔" اچانک اس نے سر اٹھا کر سنجیدگی سے کہا تھا۔ اسفندیار خاموش بیٹھا رہا تھا۔
"پھر آج آپ زوبیہ خلیل کا ماضی جان لیں ڈاکٹر اسفندیار خان! وہ یہ سب آپ کو خود بتائے گی اس لیے نہیں کہ آپ اسے بہت سچا' راست گو' سب سے مختلف اور بہت جرات مند سمجھیں' بلکہ اس لیے کہ وہ سب اگر اس نے خود نہیں بتایا تو کوئی اور آکر آپ کو بتا دے گا۔ اور کوئی اور کن الفاظ میں اور کس طرح وہ سب بتائے گا' یہ وہ سہہ نہیں پائے گی۔"
"میرے گھر میں میرے ابی تھے' میری بہت پیاری امی تھیں' دو بڑے بھائی تھے ہمارے گھر کا ماحول کٹر مذہبی قسم کا تھا' ابی میرے ابا کراچی یونیورسٹی سے پڑھے ہوئے تھے' انہوں نے ہسٹری اور فلسفہ میں ایم اے کیا ہوا تھا مگر اتنے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ مذہب کے معاملے میں انتہا پسند تھے' وہ بہت سخت گیر اور ظالم شوہر تھے۔ امی کا سارا دن اس فکر میں گزر جاتا تھا کہ کہیں کوئی بات ان کے خلاف مزاج نہ ہو جائے۔ ذرا ان کے اصولوں سے ہٹ کر کوئی بات ہوتی اور وہ زمین و آسمان ایک کر دیتے۔ امی کا کسی کے گھر جانا یا کسی رشتے دار خاص طور پر مرد رشتے دار

کا آنا انہیں بالکل برداشت نہیں ہوتا تھا۔ ان کے رویے سے خائف ہو کر لوگوں نے خود ہی ہمارے گھر آنا چھوڑ دیا تھا' امی بازار نہیں جاسکتی تھیں' وہ امی کی اور ہم بہن بھائیوں کی ساری خریداری خود کر کے لے آیا کرتے تھے۔

ہمارے گھر میں روپے پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا' ابی کا شوروم بہت اچھا چل رہا تھا اس کے علاوہ ان کی طارق رو ڈ پر تین دکانیں تھیں' جہاں سے ہر ماہ ٹھیک ٹھاک کرایہ آجایا کرتا تھا' گھر میں تین تین گاڑیاں تھیں مگر اس کے باوجود امی بہت چپ چپ اور بجھی ہوئی رہتی تھیں۔ انہوں نے شوہر کی خدمت میں خود کو مٹا ڈالا تھا مگر ابی پھر بھی معمولی سی بات پر انہیں ذلیل کر کے رکھ دیا کرتے تھے۔ ہم بہن بھائیوں کے سامنے کسی آئے گئے کے سامنے' جب وہ کسی رشتے دار کے سامنے شدید طیش کے عالم میں چیخ چیخ کر امی کو برا بھلا کہتے تو وہ مجھے بہت برے لگتے تھے۔

امی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ صرف ہم تینوں بہن بھائیوں کی وجہ سے ہی آیا کرتی تھی۔ وہ ہم لوگوں سے بہت پیار کرتی تھیں' مجھ سے تو بہت ہی زیادہ' میں اپنے بھائیوں سے بہت چھوٹی تھی' میں سات سال کی تھی جب ابی نے ریحان بھائی کی شادی طے کردی تھی' امی ان دنوں بہت بیمار رہنے لگی تھیں' جب شیما بھابی رخصت ہو کر ہمارے گھر آئی تھیں۔ ابی کے لیے ان کی بیماری ڈرامہ بازی اور ڈھکوسلہ تھی' وہ ابی سے چوری چھپے کبھی ریحان بھائی' کبھی فرمان بھائی کے ساتھ ڈاکٹر کو دکھا آتیں۔ ڈاکٹر مختلف ٹیسٹ بتاتا' دوائیں دیتا وہ دوائیں تو کھالیتیں' مگر ٹیسٹوں وغیرہ کی طرف توجہ نہ دیتیں۔ شاید ابی کے نظرانداز کرنے کی سزا وہ اپنے آپ سے لے رہی تھیں' مگر پھر ایک روز ایسا آیا جب ابی کو بھی یہ ماننا پڑا کہ وہ ڈرامہ نہیں کر رہی ہیں' مگر جب انہوں نے یقین کیا اس روز میری ماں سفید کفن اوڑھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ کر جاچکی تھی۔

چند دن ابی کے ندامت میں گزرے' انہیں تھوڑا بہت ملال ہوا کہ بیوی کے علاج معالجے پر مناسب توجہ کیوں نہ دی۔ امی سے جو خدمتیں کروانے کی عادت ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ سے بھی ان کی کمی بہت محسوس ہوئی' مگر پھر آہستہ آہستہ انہوں نے اس ماحول میں ایڈجسٹ کرلیا۔

شیما بھابی جنہیں بیاہ کر آئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے' امی کے بعد گھر کا سارا نظم و نسق ابی نے ان کے ہاتھ میں سونپ دیا تھا۔ وہ ابی کے خوب آگے پیچھے پھرتی تھیں۔ ان کا بہت خیال رکھتی تھیں اسی لیے کچھ ہی عرصے میں ان کی پسندیدہ ترین شخصیت بن گئی تھیں۔

امی کی جن خدمتوں کو وہ درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے' بھابی اس کا نصف بھی کرتیں تو وہ تعریفوں میں زمین آسمان ایک کردیتے۔ شاید اس لیے کہ وہ تو بیوی تھیں' بیوی جو پیر کی جوتی ہوتی ہے اور شیما بھابی تو ان کا خون تھیں' ان کی سگی بھانجی' لاڈلی بہن کی اولاد ابی گھر کا ہر کام شیما بھابی کے مشورے سے کرنا پسند کرتے تھے۔ میرے ساتھ شیما بھابی کے تعلقات نارمل سے تھے۔ میرا اپنا لگا بندھا روٹین تھا' جس سے ہٹنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں ان کے لیے کسی بھی قسم کی تکلیف کا باعث نہیں تھی۔ ساڑھے سات' آٹھ سال کی بچی سے انہیں پرخاش ہو بھی کیا سکتی تھی۔

ابی کا ہم لوگوں پر غیر معمولی احسان یہ تھا کہ انہوں نے ہم بہن بھائیوں کو اچھے تعلیمی اداروں میں تعلیم دلوائی تھی' مگر ریحان بھائی اور فرمان بھائی دونوں ہی کو پڑھنے کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ اس لیے دونوں گریجویشن کر کے ان کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوگئے تھے۔ میں بھی کوئی بہت اچھی ذہین طالبہ نہیں تھی' بس گزارے لائق پاس ہوجایا کرتی تھی۔ ہر بار رپورٹ کارڈ دیکھتے ہوئے ابی کا پارہ آسمان پر چڑھ جایا کرتا تھا۔

"ساری کی ساری اولاد کند ذہن ہے' کسی ایک کو بھی تعلیم کا شوق نہیں۔"

میں بڑی ہورہی تھی' ابی کے خوف کے باوجود میرے اندر بہت سی معصوم معصوم سی خواہشیں جنم لینے لگی تھیں۔ میرا دل چاہنے لگا تھا کہ میں بھی اپنی دوستوں کی طرح اپنی شاپنگ اپنی پسند سے کیا کروں' میری وارڈ روب کپڑوں سے بھری ہوئی تھی مگر ان میں میری پسند کا ایک بھی کپڑا نہیں تھا۔ سارے کے سارے ابی اور شیما بھابی کی پسند کے کپڑے تھے' اسکول کے علاوہ مجھے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میری کسی دوست کے گھر کوئی فنکشن ہوتا یا اسکول میں کوئی پکنک' پارٹی ہوتی میرے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار میری

بیسٹ فرینڈ کرن کی برتھ ڈے پارٹی تھی۔ اس نے بڑے اصرار اور خلوص سے مجھے انوائیٹ کیا۔ میں نے اس کے زیادہ اصرار سے مجبور ہو کر جب اسے یہ بتایا کہ مجھے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تو میرے پیچھے لگ گئی کہ وہ امی سے خود بات کر کے مجھے اجازت دلوائے گی۔ جب وہ ہمارے گھر دعوت دینے آئی امی ممی ڈیڈی کے ساتھ تو امی ان لوگوں سے جلتے رو کھے پھیکے اور سرد انداز میں ملے اسے دیکھتے ہوئے وہ لوگ تھوڑی دیر ہی ٹھہرے تھے۔ ان کے جاتے ہی امی جو میرے اوپر چیختے چلائے اور برا بھلا کہا تو جب تک آکر شیما بھابی نے آکر بیچ بچاؤ نہیں کرایا چپ نہیں ہوئے۔

"اپنی ماں کی طرح سیر سپاٹوں کی شوقین ہے۔ اسکول پڑھنے بھیجتا ہوں یا رشتے داریاں کرنے" آج کے بعد کسی دوست کے گھر جانے کی بات کی یا کوئی ہمارے گھر آیا تو گھر بٹھالوں گا۔" انہوں نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا تھا۔

مجھے اس سب کا پہلے ہی اندازہ تھا۔ اگلے روز میں اسکول گئی تو کرن نے بات چیت تو در کنار مجھ سے ہاتھ تک نہیں ملایا تھا۔ اس کی اور اس کے والدین کی ہمارے گھر جو عزت افزائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کا ناراض ہونا بالکل جائز تھا میرے، بہت معذرت کرنے پر بھی اس کا دل صاف نہیں ہوا تھا۔ مجھے چھوڑ کر اس نے دوسری فرینڈز بنالی تھیں۔

تب زندگی میں پہلی مرتبہ میرے دل میں امی کے لیے نفرت پیدا ہوئی تھی۔ امی "اپنا گھر اور گھر کا ماحول مجھے سب سے سخت نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔

مجھے ایسا لگتا میں کسی قید خانے میں زندگی گزار رہی ہوں۔ جس سے چند گھنٹوں کے لیے چھٹکارا مجھے صرف اسکول جا کر ہی نصیب ہوتا تھا۔ میری دوستیں فلموں، ڈراموں، فیشن، کپڑوں، کرکٹرز، فلم ایکٹرز اور ان کے اسکینڈلز کے بارے میں باتیں کرتیں اور میں ایک طرف خاموش بیٹھی انہیں دیکھتی رہتی۔

"کیوں ندیا! تمہیں عامر خان کیسا لگتا ہے؟" ایک کلاس فیلو پوچھتی تو دوسری اسے ٹہوکا دیتے ہوئے کہتی۔

"ارے اس سے کیا پوچھ رہی ہو وہ سمجھ رہی ہوگی کہ شاید عامر خان تمہارے کسی کزن کا نام ہے۔"

اس کے کمنٹس پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔ میرے ایک دفعہ کے بتا دینے پر کہ ہمارے گھر ٹی وی نہیں اب وہ لوگ اسی طرح میرا مذاق اڑاتی تھیں، کافی پہلے انہیں کرن نے بھی بتادیا تھا۔ وہ لوگ پیٹھ پیچھے تو میرا اور بھی مذاق اڑایا کرتی تھیں۔ میں دن بہ دن احساس کمتری کا شکار ہوتی جارہی تھی۔ "ٹین ایج میں انسان یوں بھی اتنا باشعور تو ہوتا نہیں اس لیے میں کلاس فیلوز کے معمولی معمولی مذاق کو لے کر بھی گھنٹوں کڑھا کرتی۔

کورس کی کتاب کے علاوہ کوئی کتاب اگر امی کو غلطی سے بھی میرے ہاتھ میں نظر آجاتی تو وہ شاید مجھے قتل کر دیتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھے کامک بک پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا، جو میں اسکول کی لائبریری سے ایشو کروا کر لائی تھی تو انہوں نے کتاب تو اٹھا کر دور پھینکی ہی تھی۔ میرے منہ پر بھی ایک زوردار تھپڑ مارا تھا۔ تب سے ہی میں نے کورس کی کتابوں کے علاوہ کسی دوسری کتاب کو ہاتھ لگانے سے توبہ کرلی تھی۔

فرقان بھائی کی شادی ہو گئی اور نجمہ بھابی ہمارے گھر آگئیں تو میرے ان تمام احساسات کو اور ہوا ملی۔ وہ ہمارے رشتے داروں میں سے نہیں تھیں، بلکہ امی کے دوست کی بیٹی تھیں۔ اور ان کے آتے ہی ہمارے گھر کے رنگ ڈھنگ میں بہت سی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ وہ ٹی وی جہیز میں لائی تھیں۔ جو ان کے کمرے میں چلتا تھا اور امی نے اس بات پر کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا میں امی سے چوری چھپے ان کے کمرے میں جا کر ٹی وی دیکھوں۔ مگر وہ مجھے، جینا اور فرخ کو تو بالکل بھی منہ نہیں لگاتی تھیں۔ شیما بھابی کو دیکھ کر بھی ان کی تیوری پر بل ہی پڑے رہتے تھے۔ شیما بھابی یہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں کہ دیورانی سے پیچھے رہ جائیں "فوراً" ہی انہوں نے امی کو پتا نہیں کس طرح رام کیا تھا کہ ریحان بھائی ان کے لیے بھی ٹی وی لے آئے تھے۔ اب وہ اپنے بچوں اور ریحان بھائی کے ساتھ آرام سے کمرے میں بند ہو کر فلمیں دیکھتیں لگی رہتیں یعنی ساری پابندیاں اور تمام اصول صرف میرے لیے تھے۔ ہماری ایک رشتے کی پھوپھی جو ذرا منہ پھٹ قسم کی تھیں، انہوں نے یہی بات امی کے منہ پر بول کر میرا دل خوش کر دیا تو امی بڑے مطمئن انداز میں بولے۔

"بہوؤں پر میں اپنا زور نہیں چلا سکتا، وہ تو پرائی ہیں۔ مگر بیٹی پر تو مجھے پورا پورا حق حاصل ہے، ریحان اور فرقان کی بیویوں کو اجازت دے دینے کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس سب پر خوش ہوں، اگر میں منع کر دیتا تو بہوؤں کے ساتھ ساتھ بیٹے بھی مجھ سے ناراض ہو جاتے، ویسے بھی یہ آج کل کے لڑکے زیادہ ہی زن مرید ہو گئے ہیں۔ ہماری طرح تھوڑی کہ بیوی کو اس کی اوقات یاد دلا کر رکھیں، یہ تو بات بات پر بیوی کا موڈ دیکھ کر کرتے ہیں کہ کس وقت کون سی بات بیگم صاحبہ کو ناگوار گزر سکتی ہے۔"

امی اپنی اس تاویل سمیت مجھے اور بھی زہر لگے تھے۔ نجمہ بھابھی اور شیما بھابھی اپنی اپنی شاپنگ اپنی مرضی سے کرتیں، بازاروں میں پھرتیں امی پوچھ نہ سکتے یہاں تک کہ شیما بھابھی چھ سالہ حنا کو بھی اس کی پسند کی شاپنگ کروا کر لے آتیں۔

جب تک خریداری امی کے ہاتھ میں تھی، چاہے رنگ اور پرنٹ اچھا نہ لگے مگر کپڑے کی کوالٹی تو اچھی ہوتی تھی۔ یہ کیسی زندگی تھی، مجھے اپنی زندگی جہنم محسوس ہوتی تھی۔ میری زندگی کا یہی وہ مقام ہے جہاں میں خجستہ میں اپنا عکس دیکھتی ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں غیر شادی شدہ تھی، اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور وہ شادی شدہ اور غریب تھی۔ ان تمام حالات سے تنگ ہو کر جو کچھ میں نے کیا، میں نہیں چاہتی تھی خجستہ بھی اپنے لیے ایسا ہی کوئی چور دروازہ تلاش کرے۔ اسے بھی چودہ سال کی عمر میں پچاس سال کے بڈھے سے بیاہ کر یہ کہا گیا تھا کہ اب تم چودہ سے نکل کر پچاس کے سن میں داخل ہو جاؤ اور مجھ سے بھی بچپن کی معصومانہ اور بے ضرر خواہشات چھین کر بڑھاپا طاری کرنے کو کہا گیا تھا۔

پھر ان دنوں جب میں اپنی زندگی سے مکمل طور پر مایوس ہو چکی تھی، اچانک ہی ایک بہت بڑی تبدیلی آگئی۔ رمیز ناصر نام تھا اس کا، میری پہلی مرتبہ اس سے اتفاقاً "ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ فون کہیں اور کر رہا تھا لیکن غلطی سے فون ہمارے گھر مل گیا تھا، اس وقت تو اس نے شائستگی سے معذرت کر کے فون بند کر دیا تھا مگر اگلے روز جب اس کا دوبارہ فون آیا اور اتفاق سے میں نے ہی اٹینڈ کیا تو وہ مجھ سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"کل آپ سے بات کرنے کے بعد سے میں مسلسل ڈسٹرب رہا ہوں، ایسی مدھر اور کانوں میں رس گھولنے والی آواز تو میں نے آج تک نہیں سنی۔ اب چاہے آپ کو میرا دوبارہ فون کرنا برا ہی لگا ہو مگر میں خود کو روک نہیں پایا۔"

میں نوجوانی کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھ رہی تھی۔ ساڑھے چودہ سال کی عمر میں مرد اور محبت دونوں ہی میری سمجھ سے باہر کی چیزیں تھیں، مگر پھر بھی مجھے اس کی باتیں سن کر کچھ مختلف سے محسوسات پیدا ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ مجھے جتنے گھٹے ہوئے ماحول میں رکھا گیا تھا، وہاں ابی اور بھائیوں کے علاوہ کسی مرد کا میری زندگی میں کہیں کوئی گزر نہیں تھا۔ مگر اپنی دوستوں سے ان کے کزنز اور دیگر رشتے داروں کے حوالے سے ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ نے اتنا تو سمجھا دیا تھا کہ ماں باپ اور بہن بھائیوں سے محبت کے علاوہ ایک اور محبت بھی ہوتی ہے "اور شاید وہ سب محبتوں سے زیادہ خوب صورت ہوتی ہے۔

میں اس کی باتوں کے جواب میں کچھ بول تو نہیں پائی تھی مگر لائن بھی ڈس کنیکٹ نہیں کی۔ میری خاموشی کو میری رضامندی جان کر اس نے اس سے اگلے روز اور پھر اس سے اگلے روز یعنی یہ کہ روزانہ فون کرنا شروع کر دیا۔

اس کے فون کا مخصوص ٹائم تھا جو میں نے ہی اسے بتایا تھا۔ دوپہر میں ابی، ریحان بھائی اور فرقان بھائی تو گھر پر ہوتے نہیں تھے۔ اور شیما بھابھی اور نجمہ بھابھی بھی اپنے اپنے کمروں میں سو رہی ہوتی تھیں، باقی رہے بچے تو وہ اپنا ہوم ورک کرنے یا کھیل کود میں مصروف ہوتے اور اس طرف توجہ ہی نہ دیتے کہ میں لاؤنج میں بیٹھ کر اتنی آہستہ آواز میں کس سے باتیں کر رہی ہوں۔ شروع شروع میں مجھے ڈر لگتا تھا کہ کہیں پکڑی نہ جاؤں مگر آہستہ آہستہ میں اس روٹین کی عادی اور بے خوف ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھار خود بھی اسے فون کرنے لگی۔ وہ لاہور کا رہنے والا تھا اور کراچی میں جاب کی وجہ سے رہ رہا تھا، اس کی فیملی وہیں تھی اور وہ یہاں احساس تنہائی کا شکار تھا۔ اس کے بھی میری طرح زیادہ دوست وغیرہ نہیں تھے۔ وہ مجھ سے اپنے گھر والوں کی باتیں کرتا۔ اپنے بہن بھائیوں کے قصے سناتا اور میں اسے اپنے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں

بتاتی۔ وہ تمام باتیں جو مجھے دن رات احساس تنہائی اور گھٹن کا شکار کیے رکھتی تھیں وہ سب میں اس سے شیئر کر کے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتی تھی۔

وہ میری دوستوں کی طرح میرا مذاق نہیں اڑاتا تھا' بلکہ مجھ سے ہمدردی کرتا۔ امی اور گھر والوں کے رویے پر 'ان لوگوں کو ظالم اور مجھے مظلوم قرار دیتا اور کہتا کہ میرا حوصلہ ہے جو میں اتنے جبرواستبداد میں زندگی گزار رہی ہوں۔

ہفتے بھر میں ایک چھٹی والا دن ایسا ہوتا تھا جب ہم بات نہ کر پاتے تھے اور اس ایک دن بات نہ کرنے پر مجھ پر جھنجلاہٹ سوار ہوتی سو ہوتی' مگر وہ مجھ سے بڑھ کر بے تاب نظر آتا۔

"ایک دن تمہاری آواز نہ سنوں تو دل بے چین ہو جاتا ہے' کچھ اچھا نہیں لگتا' اگلے روز آفس آ کر بھی سب سے لڑنے کو دل چاہنے لگتا ہے' بلاوجہ غصہ آتا ہے۔ اف زوبیہ! تم نے تو مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔"

وہ انتہائی بے بسی سے یہ جملے بولتا مجھے کسی اور ہی دنیا کی سیر کرانے لگتا۔ کیا میں زوبیہ خلیل کسی کے لیے اتنی اہم بھی ہو سکتی ہوں' جس سے کوئی دوستی کرنا پسند نہیں کرتا' جس کا سب مذاق اڑاتے اور اس سے دور دور رہتے ہیں' اسی لڑکی کے لیے وہ ایک شخص اتنی بری طرح دیوانہ ہو رہا

میں اپنی خوش بختی پر ناز کرنے لگی تھی اب گھر والوں کے رویے میرا دل نہیں دکھاتے تھے۔ اسکول اور پڑھائی پہلے کون سی مجھے بہت پسند تھی۔ اب تو اور بھی ان سب سے دھیان ہٹ گیا تھا۔

پھر اس نے مجھ سے ملنے کے لیے اصرار کرنا شروع کر دیا' شروع شروع میں' میں نے انکار کیا' اس لیے نہیں کہ میں اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی بلکہ اس لیے کہ میرے اوپر گھر والوں کا خوف سوار تھا مگر اس کا اصرار بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ ناراض ہونے لگا تو میں نے اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ شیما بھابھی سے میں نے اپنی ایک کلاس فیلو کے گھر جانے کی بات کی' جس کا گھر ہم سے اگلی گلی ہی میں تھا۔

"میرا فزکس کا جرنل' مصباح کے پاس رہ گیا ہے' اگر اس سے لا کر پریکٹیکل نہیں اتارا تو کل مِس سے بہت ڈانٹ پڑے گی۔"

جھوٹ بولتے ہوئے میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے مگر حیرت انگیز طور پر انہوں نے نہ تو کسی حیرت کا اظہار کیا اور نہ ہی کوئی اور سوال جواب اور بڑے اطمینان سے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ گھر کے قریب بنے اس پارک میں بھری دھوپ میں کسی سے سامنا ہونے کا خوف نہیں تھا' سخت ترین گرمیوں میں کس کا دماغ خراب تھا کہ پارک میں لو کے تھپیڑے کھانے آتا۔ وہ بنچ پر بیٹھا میری راہ تک رہا تھا میں نے خیالوں ہی خیالوں میں اس کا جیسا خاکہ بنایا تھا وہ اس سے بھی بڑھ کر ہینڈسم تھا۔ مجھے اس سے بہت جھجک محسوس ہو رہی تھی اور وہ مسلسل میری تعریفیں کر رہا تھا۔

"میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ خوب صورت آواز والی یہ لڑکی دیکھنے میں بھی اتنی ہی حسین ہو گی۔" وہ والہانہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور میں شرمائی لجائی اپنی تعریفیں سن رہی تھی مگر اس سب کے ساتھ ساتھ ڈر بھی بہت لگ رہا تھا' اس لیے اس کے بہت روکنے کے باوجود بھی بہت جلدی اٹھ گئی تھی۔ گھر واپس آ کر سارا دن اسی منظر کو سوچتی رہی تھی۔ اس کی والہانہ نگاہیں' پیار بھری باتیں۔

"تم سے ملنے کے بعد تو میں اور بھی تمہارا دیوانہ ہو گیا ہوں۔ سچ زوبیہ! اب تمہارے بغیر جیا نہیں جاتا' اب کی بار لاہور جاؤں گا تو امی سے تمہارے بارے میں ضرور بات کروں گا۔ تمہارے امی ابو ہماری شادی کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنیں گے نا' کہیں ایسا نہ ہو امی ابو آئیں اور تمہارے امی ابو انہیں ٹکا سا جواب دے دیں۔"

وہ فون پر مجھ سے مختلف خدشات کا اظہار کر رہا تھا۔

"امی کو ماننا پڑے گا' ضروری تو نہیں کہ میں ساری زندگی ان کے ظلم سہتے ہوئے گزاروں۔"

میرے اندر ایک باغی لڑکی پیدا ہو گئی تھی۔ جو مجھے ابی سمیت سارے زمانے سے ٹکرا جانے کا حوصلہ دے رہی تھی۔

ہاں پھر میں بھی نجمہ بھابھی کی طرح اپنی پسند سے شاپنگ کیا کروں گی' ٹی وی دیکھوں گی' فلمیں دیکھوں گی۔ اپنی مرضی کی کتابیں پڑھوں گی' کوئی صبح شام مجھ پر تنقید نہیں کیا کرے گا۔ میں اپنی مرضی سے زندگی گزاروں گی

اور وہ بھی رمیز کے ساتھ۔ وہ بے پناہ خوبرو بندہ جو مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے اس کی سنگت میں میری زندگی کتنی خوشگوار گزرے گی۔ وہ تو کبھی مجھ سے اونچی آواز میں بات بھی نہیں کرے گا' بس ہر وقت صرف مجھ سے پیار کی' خوشیوں کی اور محبتوں کی باتیں کیا کرے گا۔

"کیا بات ہے زوبی پھوپھو آپ اکیلے اکیلے کس بات پر ہنس رہی ہیں۔" حنا کی بات پر میں ایک دم چونک گئی تھی۔ رمیز کو سوچتے سوچتے شاید میرے لبوں پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی اور میرے برابر میں بیٹھی ہوم ورک کرتی حنا نے جانے کیسے یہ چیز نوٹ کر لی تھی۔

"بیٹا! آج کل آپ کی پھوپھو لگتا ہے اسکول میں روزانہ ایک پیریڈ لطیفوں کا بھی اٹینڈ کر کے آتی ہیں۔ بس گھر آ کر بھی ان ہی پر ہنستی رہتی ہیں۔" شیما بھابھی معنی خیز مسکراہٹ چہرے پر لیے بڑے گہرے لہجے میں بولی تھیں۔ میں فوری طور پر تو ان کی بات پر ڈر گئی تھی۔ ایسا لگا تھا کہ شاید انہیں کچھ شک ہو گیا ہے مگر آنے والے دنوں میں جب انہوں نے نہ تو اس حوالے سے کچھ پوچھا اور نہ ہی اپنی کسی بات یا رویے سے ایسا کچھ ظاہر کیا تو میں اپنے وہم کو نظرانداز کر گئی۔

"میں پندرہ بیس روز کے لیے لاہور جا رہا ہوں۔ پلیز جانے سے پہلے ایک بار مجھ سے مل لو' دیکھو انکار مت کرنا۔" وہ باقاعدہ میری منتیں کر رہا تھا۔ اس کی محبت نے مجھے بہت بہادر بنا دیا تھا مگر میں پھر بھی خود میں اتنا حوصلہ نہیں پا رہی تھی کہ اس سے ملوں اور وہ بھی اس کے گھر پر۔ بہت اصرار کے جواب میں' میں نے پارک میں ملنے کی بات کی تو وہ اس نے فوراً" مسترد کر دی۔

"پارک میں ملنا بھی کوئی ملنا ہے' ایسا لگتا ہے جیسے کوئی چوری کر رہے ہیں۔ کہیں کوئی دیکھ نہ لے کی تلوار سر پر لٹکی رہتی ہے۔ گھر پر ملیں گے تو اطمینان سے بات تو کر سکیں گے۔"

میں اسے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی' پھر وہ اتنے سارے دنوں کے لیے چلا جائے گا' وہ بھی میرے خلاف دل میں شکوہ اور ناراضی لیے۔ مجھے نیم رضامند دیکھ کر اس نے خود ہی آنے کے لیے مناسب وقت یعنی جب مجھے گھر میں امی وغیرہ کا خوف نہ ہو اور شیما بھابھی سے کیا جانے والا بہانا بھی بتا دیا۔ بات کرتے کرتے مجھے پیچھے کچھ آہٹ سی سنائی دی تو میں اسے ہولڈ کروا کر لاؤنج سے اٹھ کر ڈائننگ روم کی طرف آ گئی۔ لاؤنج اور ڈائننگ روم کے بیچ کوئی دروازہ نہیں تھا' بلکہ بہت خوب صورت جالی کے سفید پردوں کے ذریعے دونوں کو الگ کیا گیا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا' ڈائننگ روم سے آگے بنے کچن میں ماسی برتن دھو رہی تھی میں مطمئن ہو کر واپس آ گئی تھی۔

مقررہ وقت پر میں پارک پہنچ گئی تھی' جہاں سے وہ مجھے بائیک پر بٹھا کر اپنے گھر لے آیا تھا۔ اس کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مین روڈ کے دوسری طرف جو اپارٹمنٹس بنے ہوئے تھے وہ ان میں ہی رہتا تھا۔ اس کا دو کمروں کا فلیٹ مجھے اپنے عالیشان گھر سے کہیں زیادہ اچھا لگا تھا۔ وہ ایک کمرہ ڈرائنگ' ڈائننگ کے طور پر اور دوسرا بیڈروم کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ مجھے لے کر وہ سیدھا اپنے بیڈروم میں آ گیا تھا۔ مجھے بیٹھنے کے لیے کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو ہاتھ میں ایک بڑی سی ٹرے تھی۔ جس کے بیچوں بیچ کیک رکھا ہوا تھا' ٹرے ٹیبل پر رکھ کر وہ میرے برابر میں صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

خوب صورتی سے سجے سجائے اس کیک پر لکھا "ہیپی برتھ ڈے ٹو زوبیہ!" پڑھ کر میں کتنی دیر تک سکتے کی کیفیت میں بیٹھی رہی تھی' اس نے میری سالگرہ کا دن یاد رکھا' نہ صرف یہ کہ یاد رکھا بلکہ اسے سیلیبریٹ کرنے کا اہتمام بھی کیا' ساری زندگی میں کبھی میری کوئی سالگرہ نہیں منائی گئی تھی۔ ابی تو دوسروں کے گھر ہونے والی برتھ ڈے پارٹیز میں شرکت کرنا پسند نہ کرتے تھے۔

"کیک کاٹو۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔ مجھے مارے خوشی کے رونا آنے لگا تھا' میں نے کیک کاٹا تو اس نے خوب صورت سے ریپنگ پیپر میں لپٹا گفٹ اور محبتوں کے بھرپور اظہار میں ڈوبا کارڈ مجھے دیا۔ زندگی کے چودہ سال تو واقعی قید بامشقت کاٹی تھی یہ پندرہواں سال واقعی مختلف تھا۔ میری پندرہویں سالگرہ جو میں اس کے ساتھ منا رہی تھی۔ میں اس سب میں اتنی خوش اور مگن تھی کہ مجھے ایک بار بھی یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ میرے اتنے قریب کیوں بیٹھا ہے' اس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر کیوں رکھا ہوا ہے۔ وہ مجھے اتنی بدلی ہوئی نگاہوں

سے کیوں دیکھ رہا ہے؟ میں تو بس خوشی خوشی بھی اس کا دیا ہوا کارڈ پڑھ رہی تھی۔ کبھی وہ پرفیوم اور سوٹ ہاتھوں میں لے کر بچوں کی سی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

"آؤ آرام سے بیڈ پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو میں بغیر کوئی اعتراض کیے اس کے ساتھ اٹھ گئی تھی۔ مجھے یہ پتا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے' وہ تھوڑے دنوں بعد مجھ سے شادی کرے گا مگر اس سے زیادہ عورت اور مرد کا رشتہ کیا ہوتا ہے میں نہیں جانتی تھی۔ مگر پھر بھی مجھے اس کے اتنے قریب بیٹھنے پر اچانک گھبراہٹ ہونی شروع ہو گئی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ میں تو نہیں آ رہا تھا مگر مجھے اس کی نگاہوں سے ایک دم خوف آنے لگا تھا۔

"میں گھر جاؤں گی۔" میں خوف میں گھری بمشکل بول پائی تھی۔

"ابھی سے' ابھی تو ہم لوگ بہت ساری باتیں کریں گے اور یہ تم مجھ سے اتنا ڈر کیوں رہی ہو' میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں اور تم ڈر کر مجھے یہ احساس دلا رہی ہو کہ تمہیں مجھ سے بالکل بھی پیار نہیں۔"

وہ مخمور نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے بدستور دور بیٹھا اور گھبرایا ہوا دیکھ کر وہ اسی جادوئی لہجے میں بولا۔

"میرے قریب بیٹھو زوبیہ!"

اسی وقت دھاڑ سے کمرے کا دروازہ کھول کر کوئی اندر آیا تھا۔ ہم دونوں نے گڑبڑا کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ ریحان بھائی اور فرحان بھائی کو وہاں دیکھ کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ وہ دونوں قہر آلود نگاہیں مجھ پر ڈال کر رمیز پر پل پڑے تھے۔ وہ بمشکل خود کو ان کی گرفت سے چھڑا پایا تھا۔

"ذلیل کمینے میں تیری جان لے لوں گا۔" فرحان بھائی دوبارہ آگے بڑھے تو وہ دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولا۔

"میں زبردستی نہیں اٹھا کر لایا تمہاری بہن کو' یہ اپنی مرضی سے یہاں آئی ہے۔ بڑے غیرت والے بنتے ہو' اپنی بہن تو سنبھالی نہیں جا رہی جو مجھ سے چوری چھپے ملتی ہے۔ ارے اس کو تو اگر میں یہ کہتا کہ میرے ساتھ گھر سے بھاگ چلو یا کورٹ میرج کر لو یہ وہ بھی کر لیتی۔ ایک غیر مرد کے گھر سے اگر ایک لڑکی برآمد ہو اور وہ بھی اس طرح کہ نہ تو وہ چیخ چلا رہی ہے' نہ رو پیٹ رہی ہے تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے وہاں آئی ہے۔"

وہ استہزائیہ انداز میں بول کر اپنے منہ سے نکلنے والا خون صاف کرنے لگا تھا۔

"یہ رمیز میرے بارے میں' کس طرح سے بول رہا ہے۔"

میں بھائیوں کو دیکھ کر ڈر گئی تھی مگر رمیز کے منہ سے تمہاری بہن' مرضی' زبردستی کے الفاظ سن کر ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ ہاتھوں سے قمیص کی شکنیں درست کر رہا تھا جبکہ ریحان بھائی اور فرحان بھائی ایک دم ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

راستے بھر ان دونوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی مگر گھر آتے ہی ریحان بھائی میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے مجھے اندر لے آئے تھے لاؤنج میں بیٹھے ابی کو دیکھ کر میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔ ابی اس وقت کبھی گھر نہیں آتے تھے بلکہ ابی ہی کیا ریحان بھائی' فرحان بھائی کوئی بھی' پھر آج کیسے؟ مجھے جسم سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی' انہوں نے دھکا دے کر مجھے صوفے پر بیٹھے ابی کی طرف پھینکا تھا۔

"کیا کر رہے ہیں ریحان؟" شیما بھابھی فوراً آگے بڑھی تھیں مجھے اٹھانے کے لیے۔

"دفع ہو تم یہاں سے" آج کوئی میرے سامنے آیا تو میں اسے بھی قتل کر دوں گا۔"

وہ ہذیانی انداز میں چلائے تھے۔ وہ دونوں مل کر مجھے بری طرح مار رہے تھے' لاتیں' گھونسے' تھپڑ' میں آنکھیں بند کیے چپ چاپ پٹ رہی تھی۔

"ہماری عزت کو داغ لگا کر آئی ہے یہ بے غیرت۔ ابی! میں اس کا خون کر دوں گا۔" شاید فرحان بھائی چلائے تھے' مگر مجھے ان کی آواز صاف سنائی دے ہی نہیں رہی تھی۔ میرے کانوں میں تو کچھ اور آوازیں گونج رہی تھیں۔

"تم میری زندگی میں آجاؤ تو تمہیں کوئی کمی نہیں رہے گی ہم ایک ساتھ خوش رہیں گے۔"

"ایک غیر مرد کے گھر سے اگر ایک لڑکی برآمد ہو اور وہ

بھی اس طرح۔"

"وہ گھر کوئی تمہارے رہنے کے لائق ہے' دیکھ لینا میں بہت جلد تمہیں ان سنگدل لوگوں کی قید سے نکال لاؤں گا۔"

"اس کو تو اگر میں یہ کہتا کہ میرے ساتھ بھاگ چلو یا کورٹ میرج۔"

اچانک اتنی دیر میں پہلی مرتبہ میرے منہ سے چیخ نکلی تھی' ریحان بھائی نے اٹھا کر مجھے زور سے لات ماری تھی اور میرا سر میز کے نوکیلے کونے سے ٹکرایا' خون کا فوارہ نکلا تھا' اتنا زیادہ خون بہتا دیکھ کر بھی وہ دونوں نہیں رکے تھے۔ بند ہوتی آنکھوں سے میں نے کسی کی آواز سنی تھی' شاید نجمہ بھابھی کی جو انہیں روک رہی تھیں۔

ہوش آیا تو میں اپنے کمرے میں تھی۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا' سر میں درد کے مارے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں' پورا جسم پٹیوں میں جکڑا تھا۔ مگر اس تکلیف سے کہیں شدید وہ تکلیف اور وہ درد تھا جو میری روح جھیل رہی تھی اور اس سب سے بڑھ کر ابی کا خوف' بھائیوں کا خوف شاید وہ لوگ اب مجھے قتل کر دیں گے' ہو سکتا ہے زہر دے دیں یا سوتے میں میرا گلا دبا دیں۔ دونوں بھابھیاں میرے پاس بیٹھی تھیں' شاید ڈاکٹر کو بھی انہوں نے ہی بلایا تھا۔ ڈر کے مارے آنکھوں سے آنسو تک نہیں نکل رہے تھے۔ وہ دونوں مجھ سے جس جس طرح کے سوال کر رہی تھیں' انہوں نے مجھے چند گھنٹوں میں پندرہ سے نکال کر پچیسویں سال میں پہنچا دیا تھا۔

"پتا نہیں کب سے ملاقاتیں چل رہی ہیں' میں سیدھی سادی گھریلو عورت' مجھے کیا پتا کہ مصباح کے گھر جانے کے بہانے کہاں جایا جاتا ہے اور آج تو حد ہی ہو گئی تھی' مجھے سوتا سمجھ کر بغیر بتائے ہی اس منحوس سے ملنے گھر سے چوری چھپے نکل گئی۔ وہ تو شکر ہوا کہ ماسی نے کام کرتے ہوئے اس کی باتیں سن لی تھیں' اسی نے مجھے بتایا۔ میں نے گھبرا کر فوراً" ریحان کو فون کیا' بس نجمہ! اس واقعہ کا کسی سے ذکر مت کرنا۔ اپنا تو منہ کالا کر کے آئی ہے' کم از کم بھائی بے چارے تو سر اٹھا کر دنیا کا سامنا کر سکیں۔ اگر کسی کو بھنک بھی پڑ گئی اس بات کی تو ہم تو کہیں منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں رہیں گے۔"

وہ آنکھوں میں آنسو لیے نجمہ بھابھی کو سمجھا رہی تھیں۔ میں خاموشی سے خود پر لگنے والا ہر الزام سن رہی تھی۔ کھڑکی کے پاس سے گزرتے ابی کو دیکھ کر مجھے مزید ذلت کا احساس ہوا تھا' یقیناً" انہوں نے بھی شیما بھابھی کی تمام باتیں سن لی تھیں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی بول سکوں۔ ابی اور دونوں بھائی میری شکل دیکھنے کے بھی روادار نہ تھے۔ میں نے شدت سے خدا سے اپنے لیے موت مانگی تھی۔ شیما بھابھی یا نجمہ بھابھی کھانا یا دوا دینے میرے پاس آتیں اور پھر جس جس قسم کے سوال کرتیں وہ مجھے ذلت کے ایک اندھے غار میں دھکیل دیتے۔

"اتنی ذلت' میرے اللہ اتنی ذلت۔ بس مجھے اپنے پاس بلا لے' مجھے میری امی کے پاس بھیج دے۔"

میں سارا دن بستر میں منہ چھپائے سسک سسک کر روتی رہتی تھی۔

مجھے احساس تھا کہ میں کیا کرنے والی تھی' دن' ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو رہے تھے' میرا میٹرک کا رزلٹ آگیا تھا جس میں' میں بمشکل ڈی گریڈ لے کر پاس ہو پائی تھی۔ سارا دن اپنے کمرے میں پڑی رہتی تھی۔ کوئی مجھ سے بات کرنا میرے پاس آنا پسند نہیں کرتا تھا' رزلٹ والا اخبار بھی حنا نے مجھے لا کر دکھایا تھا' رزلٹ دیکھ کر میں زار و قطار روئی تھی' آج ابی خراب رزلٹ آنے پر مجھے نہیں ڈانٹیں گے۔ ابی کی وہ ڈانٹ جس سے میں چڑا کرتی تھی' آج اس کی خواہش مند تھی۔

"ابی پلیز! مجھے ڈانٹیں' ماریں' گالیاں دیں' مگر اس طرح نظرانداز تو نہ کریں۔"

وقت نے اتنے سے دنوں میں مجھے جو سمجھ داری دی تھی۔ اس کی بدولت میں بہت کچھ سمجھ چکی تھی۔ یہی کہ اپنے تئیں میں شیما بھابھی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر رمیز سے فون پر باتیں کیا کرتی تھی مگر وہ شروع وقت سے اس سلسلے سے آگاہ تھیں۔ سب کچھ جانتی تھیں مگر انہوں نے پھر بھی مجھے نہیں روکا تھا۔

میں نے مصباح کے گھر جرنل لانے کا بہانا کیا' انہوں نے بغیر کسی حیل و حجت کے اجازت دے دی۔ میں ناتجربہ کاری کے ہاتھوں کچھ سمجھ نہ سکی' پھر اس روز انہوں نے

ساری باتیں سن لی تھیں۔ انہیں پتا چل چکا تھا کہ میں اس کے گھر جانے والی ہوں مگر انہوں نے کچھ ظاہر نہیں کیا۔

اور انہوں نے بڑے آرام سے اجازت دے دی تھی' میں سمجھ ہی نہیں پائی تھی کہ وہ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہیں۔ انہوں نے ریحان بھائی' فرہان بھائی اور ابی سب کو خود فون کر کے بلایا تھا۔

ذلت کی اس دلدل سے اب میں کیونکر نکل پاؤں گی۔

میں اتنی نیک عورت کی بیٹی' جس کی ساری زندگی محرم' نامحرم کے چکروں میں گزر گئی' جو اتنی عفت مآب اور حیادار تھی کہ گھر میں بھی کبھی شانوں سے دوپٹہ اس کے سر سے ہٹا ہو گا اور کیا کرنے چلی تھی میں۔ کیا ماں کے دودھ میں تاثیر نہیں تھی یا میں ہی اپنے خمیر میں بے غیرتی لے کر پیدا ہوئی تھی۔ مجھے خود سے نفرت ہو گئی تھی' بے اندازہ اور بے تحاشا نفرت۔ میرا دل چاہتا میں خودکشی کر کے اس زندگی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دوں۔

پھر ایک رات نجانے رات کا کون سا پہر تھا' میرے کمرے میں گلابوں کی اور کافور کی ملی جلی سی مہک محسوس ہوئی۔ کوئی میرے سرہانے بیٹھ گیا اور میرے ماتھے پر بڑی نرمی اور محبت سے ہاتھ رکھا۔ وہ کتنا مانوس سا لمس تھا' میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔

"امی!" میں بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"زوبی! اپنی امی کے گلے نہیں لگو گی' امی سے پیار نہیں کرو گی۔" انہوں نے بانہیں پھیلائی تھیں اور میں بالکل بچپن کی طرح ان کے سینے میں منہ چھپا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔

"امی مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔ کوئی مجھ سے بات نہیں کرتا' سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے بہت بڑی غلطی اور ابی وہ تو میری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔" بے ربط جملے میرے منہ سے نکل رہے تھے' وہ پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

"تم اپنے ابی سے معافی مانگ لو۔" انہوں نے اپنے مخصوص نرم ملائم لہجے میں کہا تھا۔

"وہ کبھی بھی مجھے معاف نہیں کریں گے' کیا آپ ابی کو جانتی نہیں ہیں' وہ تو بغیر قصور کے سزا دیا کرتے ہیں جبکہ اب کی بار تو واقعی میرا قصور ہے۔" میں روتے ہوئے ان کی بات کی نفی کر رہی تھی۔

"زوبی! میری بات سنو۔" انہوں نے مجھے خود سے الگ کرتے ہوئے پہلی بار سخت لہجہ اختیار کیا تھا۔ میں دھندلی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"تم میری بیٹی ہو' ماہ طلعت کی بیٹی۔ تمہیں خود کو ثابت کر کے دکھانا ہے کہ تم ماہ طلعت کی بیٹی ہو۔ اتنی ہی اچھی' اتنی ہی نیک اور اتنی ہی ایثار پیشہ۔ نیک اولاد صدقہ جاریہ ہوتی ہے اور تمہیں ایسی ہی بیٹی بن کر دکھانا ہے' تمہیں سب کو بتا دینا ہے کہ تم ایک شریف ماں کی شریف بیٹی ہو۔"

وہ اپنے ہاتھوں سے میرے آنسو صاف کرتے ہوئے حکیمانہ انداز میں بول رہی تھیں۔ میں بس چپ چاپ ان کا چمکتا نورانی چہرہ تکے جا رہی تھی۔

"اب زندگی میں کبھی ڈگمگانا نہیں ہے' کبھی راہ سے بھٹکنا نہیں ہے' تمہیں ایسا بننا ہے زوبی! کہ میں تم پر فخر کر سکوں' تم اپنے ابی کا مان رکھو گی؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں۔" میرے جسم کے روئیں روئیں سے صدا بلند ہوئی تھی۔

"میں نے اپنی بیماری کے سخت ترین دنوں میں اکثر خدا سے ایک ہی دعا مانگی تھی' جو میرے ساتھ ہوا وہ میری بیٹی کے ساتھ نہ ہو' اس کی زندگی میں ایسا شخص آئے جو اس سے محبت بھی کرے اور اس کی عزت بھی کرتا ہو اور ایسا شخص تمہاری زندگی میں ضرور آئے گا' یہ راہ میں آئے پتھر' تمہیں ان سے ٹھوکر نہیں کھانی' خود کو سنبھال کر بچا کر اس کے لیے رکھنا ہے۔ تم دیکھنا وہ ضرور آئے گا۔"

آنکھ کھلی تو امی میرے پاس سے جا چکی تھیں مگر ان کی آواز' وہ میٹھا شہد آگیں لہجہ' وہ پیار بھرا لمس' وہ سب میرے پاس چھوڑ گئی تھیں۔ اچانک مجھے پتا نہیں کیا ہوا تھا میں بستر سے اٹھ گئی تھی۔ اپنے کمرے سے نکلی تو مجھے خود نہیں معلوم تھا میں کہاں جا رہی ہوں۔ چند لمحوں بعد میں نے خود کو ابی کے کمرے میں پایا تھا۔

"ابی مجھے معاف کر دیں' پلیز مجھے معاف کر دیں۔ ابی میں بھٹک گئی تھی' مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مگر آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ زندگی بھر آپ کو کبھی ناراض نہیں کروں گی' ایسا کچھ نہیں کروں گی جس

سے آپ کو تکلیف ہو۔"

میں ان کے پاؤں پکڑ کر چیخ کر روتے ہوئے بول رہی تھی۔ وہ گہری نیند سے بیدار ہوئے تھے' تکیے سے ذرا سا سر اٹھائے وہ مجھے خاموشی سے دیکھ رہے تھے' وہ اپنے پاؤں کھینچ کر دور ہٹانے لگے تو میں ان کے پیروں پر سر رکھ کر رو دی تھی۔

"ابی میرا یقین کریں میں نے کوئی گناہ نہیں کیا' میں اپنی مری ہوئی ماں کی قسم کھاتی ہوں کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا' آپ کی عزت کو داغ دار نہیں کیا۔"

وہ جواب میں کچھ بھی نہیں بولے تھے' بہت دیر تک رونے کے بعد میں خود ہی چپ ہو گئی تھی۔

"صبح ہونے میں تھوڑی سی دیر رہ گئی ہے' جاؤ جا کر سو جاؤ۔"

وہ مجھ پر نظر ڈالے بغیر سامنے دیوار پر نظریں مرکوز کیے سپاٹ لہجے میں بولے تھے۔

"آپ کے کہنے سے گئی تھی میں امی کے پاس' میں نے آپ سے کہا تھا نا' وہ کبھی بھی مجھے معاف نہیں کریں گے اور وہ مجھے معاف کیوں کریں' زندگی میں پہلی بار تو وہ کسی بات پر مجھ سے ناراض ہوئے ہیں۔" میں خود کو بمشکل گھسیٹ کر واپس اپنے کمرے میں لا پائی تھی اور آتے ہی اپنے بیڈ کی اس جگہ پر جہاں ابھی ابھی امی بیٹھ کر گئی تھیں' ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑبڑائی تھی لہجے میں شکوہ تھا' ناامیدی تھی اور گہری مایوسی بھی۔

اگلے روز میں نے کمرے میں لیٹے لیٹے ابی' ریحان بھائی اور فرہان بھائی کے لڑنے کی آوازیں سنی تھیں' پتا نہیں وہ لوگ کس بات پر جھگڑ رہے تھے مگر آوازیں بہت بلند تھیں۔ ابی کی آواز ان دونوں کے مقابلے میں ہلکی تھی۔ شاید وہ لوگ لاؤنج میں تھے۔

"آپ اس بے غیرت کو ایک بار پھر آزمانے جا رہے ہیں' انسان وہ جو ٹھوکر کھا کر سنبھل جائے مگر آپ اس پھر بھی اس پر اعتبار کرنے کے لیے تیار ہیں۔" فرہان بھائی چیخے تھے۔

"ہمیں اسے ایک موقع دینا چاہیے فرہان۔" ابی کی دھیمی سی آواز آئی تھی۔

"آپ موقع کی بات کر رہے ہیں میرا بس چلے تو میں اس کی لاش کے بھی اتنے ٹکڑے کروں کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ آپ اسی منحوس سے یا پھر کسی کے بھی ساتھ دو بول پڑھوا کر اسے یہاں سے دفع کریں۔ سچ کہتا ہوں ابی اس کی شکل دیکھوں تو خون کھولنے لگتا ہے' صرف آپ کی ہی وجہ سے وہ زندہ سلامت یہاں موجود ہے۔" وقفے وقفے سے اسی طرح کے جملے میری سماعتوں سے ٹکرا رہے تھے۔

"میں فیصلہ کر چکا ہوں ریحان! اب چاہے تم لوگ راضی ہو یا نہیں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" یہ آخری جملہ تھا جو ابی نے اس رات بولا تھا۔ ان کی بات کے جواب میں شدید طیش کے عالم میں ریحان بھائی نے فوراً کہا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر میں یہ گھر چھوڑ دوں گا' میں اپنی بیوی بچوں کو لے کر کل ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

ابی نے انہیں روکنے یا سمجھانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ میں کمرے میں ساکت پڑی تھی۔ مجھے پتا تھا ابی بیٹوں خاص طور پر ریحان بھائی کو کتنا چاہتے ہیں۔ شیما بھابھی اور ان کے بچوں میں ابی کی جان ہے' مگر پھر جب گزرتے کئی دنوں میں بھی وہ لوگ کہیں نہیں گئے تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ شاید ابی نے انہیں منا لیا ہے اور کہیں جانے سے منع کر دیا ہے' مگر یہ بات بہت سالوں بعد میری سمجھ میں آئی تھی کہ ابی نے انہیں روکنے یا منانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ ریحان بھائی تو سخت ترین غصے کی حالت میں گھر چھوڑنے پر تلے بیٹھے تھے مگر شیما بھابھی نے انہیں سمجھا بجھا کر ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ ریحان بھائی ان ہی کے دماغ سے سوچتے تھے' ان ہی کی زبان بولتے تھے' پتا نہیں شیما بھابھی نے ان پر ایسا کیا جادو کیا ہوا تھا کہ وہ آنکھیں بند کر کے جو کچھ وہ کہتیں کیے جاتے اور شیما بھابھی اتنی عقل مند تو بہرحال تھیں کہ ابی کی دولت جائیداد میں سے اپنا اور اپنے بچوں کا حق کسی خود ساختہ انا' ضد اور غیرت کے نام پر قربان نہ کرنے دیتیں۔

ابی نے میرا کالج میں داخلہ کروا دیا تھا' بات وات انہوں نے مجھ سے کوئی خاص نہیں کی تھی بس فارم ملا کر دے دیا' پھر خود ساتھ لے جا کر ایڈمیشن سے متعلق تمام کارروائی نبٹا دی۔ ابی کو بہت شوق تھا کہ ان کا کوئی ایک بچہ ڈاکٹر بنے'

اسی وجہ سے انہوں نے انٹر میں فرمان بھائی کو پری میڈیکل گروپ میں داخلہ دلوایا تھا' مگر ان کو پڑھائی کا شوق ہی نہیں تھا۔

میں نے خود سے عہد کر لیا تھا کہ مجھے ابی کی نظروں میں سرخرو ہونا ہے' امی سے کیا وعدہ نبھانا ہے اور یہی سوچ مجھے پری میڈیکل کی طرف لے گئی تھی۔

پھر میں جو کتابوں' پڑھائی اور اسکول کے نام سے بیزار رہا کرتی تھی' ایک دم بدل گئی۔ پڑھائی' پڑھائی اور بس پڑھائی' میری زندگی کا محور اس کے علاوہ کچھ تھا ہی نہیں۔ کالج میں' میں نے کسی سے بھی دوستی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گھر میں ابھی بھی مجھ سے کوئی بات نہیں کرتا تھا' بھائیوں کے سامنے تو میں خود ہی آنے سے گریز کرتی تھی' مجھے ان کی اپنی سمت اٹھتی لال انگارہ آنکھیں دہلا دیا کرتی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر خون اتر آتا تھا۔ شیما بھابھی اور نجمہ بھابھی ضرورتاً بات کرتی تھیں اور امی بھی کبھار کمرے میں آکر'

"کچھ چاہیے تو نہیں؟"

"پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟" قسم کے مختصر سوال جواب کر کے دو چار منٹ میں ہی واپس چلے جایا کرتے تھے۔

اب ابی کے پیسے دینے پر شیما بھابھی میرے لیے جیسے بھی کپڑے لاتیں' مجھے ان میں کوئی عیب نظر نہیں آتا تھا۔ وہ لوگ اپنے اپنے بچوں کو لے کر گھومنے پھرنے جا رہے ہیں یا ٹی وی دیکھ رہے ہیں مجھے اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا' میرے لیے تو زندگی کا مقصد صرف پڑھائی تھی۔

"تم ماہ طلعت کی بیٹی ہو' تمہیں ایسا بننا ہے زوبی کہ میں تم پر فخر کر سکوں۔" یہ جملے مجھے مسلسل اور پیہم جدوجہد پر اکساتے رہتے تھے۔ ہر رات میں پڑھتے پڑھتے ہی ریڈنگ ٹیبل پر سر رکھ کر سو جایا کرتی تھی۔ بستر پر باقاعدہ سونے کے ارادے سے لیٹنا میں بھول چکی تھی۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے لوگ کیا کر رہے ہیں' کون کیا کہہ رہا ہے اور کون کیا کر رہا ہے۔ میں نہیں جانتی تھی۔

جس روز میرا انٹر کا رزلٹ آیا اور میں ۸۴٪ نمبر لے کر پاس ہو گئی تو بے اختیار میں نے امی کی تصویر کی طرف دیکھا تھا' مجھے ایسا لگا تھا جیسے ان کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

میرے کچھ کہے بغیر ابی نے خود ہی میڈیکل کالج میں ایڈمیشن کے لیے فارم لا دیا تھا۔ ان کے دو ٹوک انداز کے سامنے کبھی بھی کوئی ٹک نہیں سکتا تھا' سو ریحان بھائی اور فرمان بھائی دونوں تھوڑا بہت کہہ سن کر چپ ہو گئے تھے۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ میری شادی کر دینی چاہیے' میں قابل بھروسا نہیں۔ کو ایجوکیشن میں پڑھ کر کیا گل کھلاؤں گی۔

میں نے کالج جانا شروع کر دیا' سر سے لے کر پاؤں تک چادر لپیٹ کر۔ کالج کے مقابلے میں میڈیکل کالج کی کچھ الگ سی اور بڑی متحرک زندگی تھی۔ مگر میرا انداز وہاں بھی ویسا ہی تھا۔ پڑھائی کے حوالے سے میری دو چار لڑکیوں سے بات چیت تھی' وہ بھی اس لیے کہ مختلف اسائنمنٹس یا پریکٹیکلز کے لیے گروپس میں کام کرنا ہوتا تھا' مگر اس بات چیت میں دوستی کا رنگ شامل نہیں تھا۔ اکثریت کے نزدیک میں ایک مغرور لڑکی تھی' لڑکوں سے ضرورتاً بھی بات چیت نہیں تھی۔

لڑکے تو لڑکے لڑکیاں بھی میری غیر موجودگی میں میرے بارے میں مختلف کمنٹس دیا کرتیں۔ پیٹھ پیچھے میرا مذاق اڑایا جاتا' اپنے اس رویے کے سبب اکثر میں نقصان اٹھاتی تھی' لڑکے لڑکیاں گروپس میں کمبائن اسٹڈی کرتے اور میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے سب سے الگ تھلگ امتحان کی تیاری کرتی' اکثر تھیوری اور وائیوا میں میرے نمبر دوسروں کے مقابلے میں اسی لیے کم ہوتے تھے کہ میں صرف لیکچرز' بکس اور نوٹس پر اکتفا کرتی تھی جبکہ باقی سب ساتھ بیٹھ کر ڈسکس کر کے تیاری کرتے تھے اور ڈسکشن میں ہی ان کا کونسیپٹ کلیئر ہو جایا کرتا تھا۔

اس سب کے باوجود جب میں حنا یا مہرین کے منہ سے جملہ سنتی۔

"زوبی پھپھو امی نے آپ سے بات کرتے دیکھ لیا تو بہت ناراض ہوں گی' وہ سونے لیٹ جائیں پھر میں آپ کے پاس آؤں گی۔"

تو بہت ضبط کرنے کے باوجود میری آنکھیں چھلک پڑتی تھیں' فرخ اور ارسلان مجھ سے پڑھائی میں مدد لینے جس وقت چاہے آجایا کرتے تھے۔

اور میں خوشی خوشی ان کی مدد کر دیا کرتی تھی مگر حنا اور مہرین پر ان کی ماؤں کی طرف سے سخت ترین پابندی تھی کہ وہ

بات کرتی نظر نہ آئیں۔

ایک دو مرتبہ میرے کمرے میں آکر حنا کو ڈانٹتے ہوئے اسے اٹھاتے وقت شیما بھابھی نے بڑی بے چارگی سے کہا تھا "مجھے تو کوئی اعتراض نہیں' مگر ریحان ناراض ہوتے ہیں۔" اور ایک دو مرتبہ کے بعد ہی میں محتاط ہو گئی تھی۔ مگر وہ دونوں شیما بھابھی اور نجمہ بھابھی کی نظروں سے بچ کر آہی جایا کرتی تھیں۔

ابی کا شروع ہی سے سب پر ایسا رعب و دبدبہ رہا تھا کہ پوتے پوتیاں بھی ان سے بہت سنبھل کر اور محتاط ہو کر بات کیا کرتے تھے حالانکہ اب ابی کو غصہ نہیں آتا تھا'

انہوں نے بات بات پر چیخنا چلانا ختم کر دیا تھا' وہ شوروم بھی تھوڑی بہت دیر کے لیے جاتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت عبادت کرتے یا پھر اسٹڈی میں کتابیں پڑھتے گزرا کرتا تھا۔ مجھے پتا تھا ابی کی خاموشی کا سبب میں ہوں۔ میں نے ان کا اٹھا ہوا سر جھکا دیا ہے' وہ وقت سے پہلے اتنے بوڑھے اور نڈھال میری وجہ سے ہو گئے ہیں۔ مگر یہ سب جاننے کے باوجود میں کچھ کر نہیں سکتی تھی' ہمیشہ ان سے اتنی دور اتنے فاصلے پر رہی تھی کہ اب ان کے پاس جاتے جھجک ہوتی تھی۔ میرا دل چاہتا' میں ابی کی خوب خدمت کروں' ان کے جوتے اپنے ہاتھوں سے پالش کروں' بالکل امی کی طرح ان کے کپڑوں اور کھانے پینے کا خیال رکھوں۔ ان سے پوچھوں کہ آپ نے کھانا پینا اتنا کم کیوں کر دیا ہے۔ اب جب میں انہیں آدھی پون روٹی کھا کر اٹھتا دیکھتی تو میرا دل رو پڑتا تھا۔

پھر میری یہ خواہش کہ میں ابی کی خدمت کروں قدرت نے بڑے تکلیف دہ انداز میں پوری کی تھی۔ وہ شوروم سے گھر واپس آ رہے تھے جب راستے میں ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اس ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں ان کا آدھا جسم مفلوج ہو گیا تھا۔ وہ قدم جن کی چاپ سن کر ہم لوگ سہم کر چھپ جایا کرتے تھے آج وہیل چیئر پر تھے۔ ہر وقت ان کی خدمت کے لیے ایک آدمی درکار تھا' وہ کوشش کرتے کہ وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے اپنا جتنا کام خود کر سکتے ہیں کر لیں' شروع شروع میں سب بڑی تندہی سے ان کی خدمت اور تیمارداری میں لگے مگر آہستہ آہستہ سب بیزار ہونے لگے' ابی وقت بے وقت آواز دیتے تو شیما بھابھی کا منہ بن جاتا' ابی کے سامنے تو وہ وہی چاپلوسانہ مسکراہٹ لے کر جاتی تھیں مگر میری نگاہوں سے ان کی ناگواری چھپ نہیں پاتی تھی۔

"بھابھی! آپ رہنے دیں میں کر لوں گی۔"

میرا فائنل ایئر چل رہا تھا' کبھی کالج کبھی ہاسپٹل' مگر پڑھائی کے مشکل ترین دنوں میں بھی ابی کی طرف سے غافل نہیں ہوتی تھی۔ انہیں نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے لیے میرا دل نہیں مانتا تھا۔ نوکر بھی تو اسی وقت خیال رکھتے ہیں جب گھر والے خیال رکھیں۔

"ابی! چلیں تھوڑی دیر لان میں چل کر موسم کا لطف اٹھاتے ہیں۔"

میں ہاسپٹل میں نائٹ ڈیوٹی کا سخت ترین شیڈول بھگتا کر گھر واپس آئی تو کمرے میں اکیلے لیٹے ابی سے مخاطب ہوئی۔

"تھکی ہوئی آئی ہو' تھوڑی دیر آرام کر لو۔" وہ اب مجھ سے باتیں کرنے لگے تھے' میں انہیں اپنے کالج اور ہاسپٹل کے قصے سناتی' وہ مجھے اپنی کسی نئی پڑھی ہوئی کتاب میں سے کوئی اقتباس سناتے۔

"میں بالکل بھی تھکی ہوئی نہیں ہوں۔" میں مسکراتے ہوئے ان کی وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی لان میں لے آئی۔ لان میں موسم انجوائے کرتے میں ان سے بہت سی لایعنی باتیں کرتی۔

"یہ وائٹ للی کتنا خوب صورت لگ رہا ہے۔"

"مالی نے گیندے کے پھول اب تک کیوں نہیں لگائے۔"

"کراچی میں تو دسمبر کے مہینے میں بھی پنکھے اور اے سی چلانے پڑتے ہیں۔"

ہم بہت دیر تک ایسی باتیں کرتے رہتے۔ میں ان کے لیے اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتی' کئی بار میرے پکائے کھانے کی تعریف کرتے ہوئے ابی بے ساختہ کہتے۔

"زوبی! تمہارے ہاتھوں میں اپنی ماں کا ذائقہ ہے۔"

میں انہیں تعجب سے دیکھتی' جس عورت سے وہ ساری زندگی شاکی رہے۔ آج بہت شگفتہ لہجے میں اسی عورت کی تعریف کر رہے تھے۔ وہ اپنی کوئی بھی کیفیت مجھ سے شیئر نہیں کرتے تھے مگر مجھے پتا تھا۔ انہیں بیٹوں کا اجنبی انداز کتنا دکھ دیتا تھا' ریحان بھائی تو پھر بھی دن بھر میں ایک مرتبہ انہیں سلام کرنے اور خیریت پوچھنے ان کے کمرے میں

چلے آتے تھے مگر فرمان بھائی ایسی زحمت بھی کبھار ہفتوں میں کیا کرتے تھے۔ وہ جس کے جاہ و جلال کے سامنے ایک دنیا کانپتی تھی۔ آج بے بسی کی تصویر بنا نیرنگیٔ زمانہ دیکھتا۔

میں نے برسوں سے خاندان کی تقریبات میں آنا جانا چھوڑ رکھا تھا' ابی کے رویے کی وجہ سے خاندان میں بہت کم لوگوں سے ہمارا میل ملاپ تھا اور ان میں سے بھی کسی کے گھر سے بلاوا آتا تو میں جانے سے معذرت کر لیا کرتی تھی۔ ایسے ہی ایک مرتبہ میری فرسٹ کزن کی شادی کا بلاوا آیا۔ شیما بھابھی نے مجھ سے بڑے اصرار سے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ مجھے ان کے اصرار پر تعجب تھا' اگر میں جاتی نہیں تھی تو کوئی بھی مجھ سے ساتھ چلنے کو کہتا بھی نہیں تھا۔ ان کے بضد ہونے پر میں جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی' ان دنوں میں ویسے بھی بہت خوش تھی۔ میں نے اتنے برسوں میں پہلی مرتبہ ریحان بھائی کی ناراضی کچھ کم ہوتی محسوس کی تھی' انہیں بہت تیز بخار ہو گیا تھا اور اب میں اس قابل تو ہو چکی تھی کہ انہیں ملیریا کی دوا دے سکوں' میں نے خوب دل لگا کر ان کا علاج اور تیمارداری کی تھی' وہ بغیر کسی ڈاکٹر کے پاس گئے ہی ٹھیک ہو گئے تھے' اگرچہ انہوں نے منہ سے کچھ نہیں کہا تھا مگر ان کی نظروں میں وہ مخصوص نفرت اور مجھے زندہ دفن کر دینے کی خواہش بھی نظر نہیں آئی تھی۔

میں نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ شیما بھابھی سے یہ بات برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ہم دونوں بھائی بہن کو ساتھ بیٹھا دیکھ نہیں پائی تھیں اور اسی لیے مجھے خاص طور پر شادی میں لے کر گئی تھیں۔ میں بہت سالوں سے رشتے داروں سے دور تھی مگر اس روز مجھے وہاں دیکھ کر جس طرح لوگوں نے سرگوشیوں میں باتیں کرنی شروع کی تھیں وہ مجھے یہ بات سمجھانے کے لیے کافی تھی کہ میرے مہربانوں کے توسط سے میری کردہ ناکردہ سب غلطیاں طشت ازبام ہو چکی ہیں۔

لوگوں کی نظریں' ان کی سرگوشیانہ باتیں' میرا دل ریزہ ریزہ کر رہی تھیں' میں اپنے آنے پر پچھتا رہی تھی' مگر گھر واپس آتے ساتھ ہی شیما بھابھی کو ریحان بھائی اور فرخ کے سامنے رو رو کر واویلا کرتے دیکھ کر میں سکتے کی کیفیت میں کھڑی رہ گئی تھی۔

''کتنا دل دکھا ہے آج میرا وہاں سب کی باتیں سن کر۔ میں کس کس کو سمجھاؤں کہ بچی تھی' نادانی میں ایک بھول ہو گئی اب اسے معاف بھی کر دیں۔ زوبی کو دیکھ کر سب نے مجھ سے ایسی ایسی باتیں کیں کہ میرا دل چاہ رہا تھا ان لوگوں کا منہ توڑ دوں۔'' اور ریحان بھائی کی آنکھوں میں دوبارہ وہی نفرت وہی غصہ اور وہی خون اتر آیا۔ میرا دوا پلانے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ انہوں نے غصے سے جھٹک کر سب ہی کو اپنے کمرے سے نکال دیا تھا۔ اگلے روز انہوں نے حنا کو صرف اتنی سی بات پر تھپڑ مار دیا تھا کہ اس نے اسکول کے سالانہ فنکشن میں ڈرامہ میں حصہ لے لیا تھا۔

رات میں ابی کے لیے کمرے میں کھانا لے کر گئی تو انہوں نے بہت غور سے میری طرف دیکھا تھا۔

''تم روئی تھیں زوبی؟'' بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اچانک انہوں نے سوال کر کے مجھے بوکھلا دیا تھا۔

وہ برسوں پہلے کے اس واقعے کے حوالے سے یا کسی اور بات کے حوالے سے کبھی بھی مجھ سے کوئی بات نہیں کرتے تھے بات کی تو صرف پڑھائی کے حوالے سے۔

''ابی! اگر ہم سے کوئی غلطی ہو جائے اور پھر بعد میں ہمیں اپنی غلطی کا احساس بھی ہو جائے اور ہم اللہ سے اپنی غلطی کی معافی مانگیں تو کیا وہ معاف کر دیتا ہے؟'' میں نے سر جھکائے جھکائے سوال پوچھا تھا۔

''بے شک وہ اپنے بندوں کے گناہ معاف کر دیا کرتا ہے۔'' وہ پریقین لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

''اور لوگ؟'' میں نے ان کی طرف ایک پل کے لیے نظریں اٹھا کر دیکھا تھا' وہ میرے سوال پر چونک گئے تھے۔

''لوگ نہیں معاف کرتے' ہے نا ابی؟'' میرا لہجہ بہت ٹوٹا ہوا تھا۔

''اتنی صابر ماں کی بیٹی ہو کر ایسی باتیں کر رہی ہو۔'' وہ میرے ہاتھ تھام کر ٹوکنے والے انداز میں بولے تھے اور پتا نہیں ابی کا رویہ ایسا کیوں تھا' مجھ سے کچھ پوچھ بھی نہیں رہے اور امی کا نام لے کر نصیحت کر دی۔

پھر جس روز میں ایم بی بی ایس کا رزلٹ ہاتھ میں لیے ابی کے سامنے گئی تو اتنے برسوں میں پہلی بار انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا تھا۔ ان کے گلے لگانے کی دیر تھی میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ وہ پیار سے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے خود بھی رو رہے تھے۔ میں نے انہیں اس روز سے پہلے کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔

''تم واقعی ماہ طلعت کی بیٹی ہو' بالکل اسی کی طرح' ہو بہو

اس جیسی۔" ان کے بھیگے ہوئے لہجے پر میں نے چونک کر سر اوپر اٹھایا تھا۔

"ابی! آپ رو رہے ہیں؟"

"نہیں۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔" وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے مسکرائے تھے۔ امی کی نظروں میں سرخرو ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ اس روز مجھے پہلی بار اس بات کا ادراک ہوا تھا کہ زندگی بھر ہر قدم پر ابی کے آگے جھکتی اور مسلسل شکست کھاتی امی' مرنے کے بعد اپنی ہر شکست کا بدلہ لے گئی تھیں۔ وہ دراصل پچھتاووں میں گھرے زندگی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ امی کا صبر ابی کے ہر ظلم پر حاوی ہو گیا تھا۔

ابھی میں اپنی اس خوشی کو ڈھنگ سے منا بھی نہیں سکی تھی' کہ اسی روز میرے کلاس فیلو شعیب احمد کی والدہ اور بہنیں ہمارے گھر میرا رشتہ لے کر آگئی تھیں۔ وہ ہماری کلاس کا سب سے جینئس لڑکا تھا' فائنل ایئر میں بھی اس نے فرسٹ پوزیشن لی تھی۔ کلاس فیلو ہونے کے ناتے تو ظاہر ہے میں اسے جانتی ہی تھی اور اس کی ذہانت کی وجہ سے دیگر کلاس فیلوز کی طرح اس سے مرعوب بھی رہا کرتی تھی۔ وہ کلاس میں موجود ہوتا تو پروفیسرز کی حالت قابل رحم ہوا کرتی' اس کے مشکل سوالات کے جواب دینا اچھے اچھوں کے بس کی بات نہیں تھی۔

میرے علاوہ دوسری کئی لڑکیاں تھیں جو مجھ سے زیادہ ذہین اور حسین تھیں' اتنی بہت سی لڑکیوں کو چھوڑ کر اس نے ایک ایسی لڑکی کا انتخاب کیا تھا جس سے کالج کے پانچ سالوں میں اس کی کبھی دعا سلام تک نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اس بات پر خوش ہونا چاہیے تھا' اس نے اتنے سالوں تک میرا خاموش تجزیہ کیا تھا اور یقیناً" میں اسے اس قابل لگی تھی کہ وہ مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کی خواہش کر بیٹھا تھا مگر اپنے حالات بخوبی جانتے ہوئے میں ان لوگوں کی آمد کا مقصد جان کر پوری جان سے کانپ گئی تھی۔ ابی نے ان سے بہت اچھی طرح بات کی تھی۔ بڑی خندہ پیشانی سے ملے تھے' مگر میں تیما بھابھی اور نجمہ بھابھی کی نگاہوں میں لکھے شکوک و شبہات اور معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر دل ہی دل میں ڈر رہی تھی۔

"ابی! میری اس سے کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ پڑھائی کی حد تک بھی نہیں۔ پتا نہیں اس نے اس طرح کیوں....." ابی کے سامنے یہ وضاحت کرتے ہوئے میں شرم سے زمین میں گڑ رہی تھی۔

"اب کی بار کلاس فیلو سے چکر چلایا ہے' پتا نہیں ایسی لڑکیوں میں کیا گٹس ہوتے ہیں جو مرد اس طرح ان کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔"

نجمہ بھابھی کسی کو فون پر بتا رہی تھیں تو تیما بھابھی ریحان بھائی کو میرا تازہ ترین کارنامہ مکمل سیاق و سباق کے ساتھ سنا رہی تھیں۔ میں بغیر سنے بھی جانتی تھی کہ مجھ پر کیا کیا الزام لگائے گئے ہوں گے۔ اگلے روز ابی کو ریحان بھائی سے اس رشتے کے بارے میں بات کرتے سنا تھا۔

"مجھے وہ لوگ اچھے لگے ہیں' لیکن تم پھر بھی لڑکے کے بارے میں ذرا چھان بین کروا لو۔" ریحان بھائی جواباً خاموش رہے تھے' شاید انہوں نے یہ سوچا ہو گا کہ شادی ہو جائے گی تو ان کو میری منحوس شکل سے تو کم از کم چھٹکارا تو نصیب ہو ہی جائے گا۔ مگر کسی چھان بین کی نوبت آئی ہی نہیں تھی' ابی' شعیب کے گھر والوں کی طرف سے کسی فون کال' کسی رابطے کے منتظر ہی رہے تھے اور وہاں سے پھر دوبارہ کوئی بھی نہیں آیا تھا۔

رشتہ لے کر آتے وقت اتنا جوش و خروش اور جلدی اور اس کے بعد اتنی خاموشی اور سناٹا' میں نے محسوس کیا تھا کہ ابی لاشعوری طور پر سارا دن فون کے پاس بیٹھے رہتے تھے' شاید اس لیے کہ انہیں پتا تھا کہ خاندان میں اور قریبی جاننے والوں میں سے تو کسی گھر سے میرا رشتہ آنا نہیں تھا' یہ واحد رشتہ ہی میری شادی کی آخری امید تھی' مگر ان لوگوں تک جو میرے کارناموں کی مفصل رپورٹ پہنچی تھی اس کے بعد وہ ہمارے گھر کیوں آتے۔

مجھے ان لوگوں کے نہ آنے کا کوئی ملال نہیں تھا' مگر اس سب کے نتیجے میں جو مزید ذلت اور رسوائی میرے حصے میں آئی تھی وہ ناقابل برداشت تھی۔

"کلاس فیلو سے عشق لڑا لیا' ساتھ پڑھتے تھے' پانچ سال سے چکر چل رہا ہو گا۔" ایسی ہی کئی باتیں مجھے لہولہان کرتیں اور میں چپ بیٹھی رہتی۔

♥ ♡ ♡ ♥
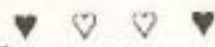
اس روز ابی کی طبیعت کافی خراب تھی' میں بیڈ پر ان کے پاس بیٹھی ان کا سر دبا رہی تھی۔ وہ آہستہ آواز میں مجھے پتا نہیں کیا کیا بتا رہے تھے۔

طارق روڈ کی ایک دکان میرے نام ہے' لاکر میں رکھا امی کا سارا زیور میرا ہے' ابی نے اپنے اکاؤنٹ میں موجود سارا پیسہ میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیا ہے۔" میں نے اکتائے ہوئے انداز میں انہیں ٹوک دیا تھا۔

"ابی! مجھے یہ سب نہیں چاہیے۔"

"پھر کیا چاہیے؟" وہ تھوڑا سا مسکرائے تھے۔

"آپ کی دعائیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ یقین دہانی کہ آپ مجھ سے خفا نہیں۔"

انہوں نے اپنے ماتھے پر رکھا میرا ہاتھ سینے پر رکھ لیا تھا۔

"میری سب دعائیں تمہارے لیے ہیں اور تم سے میں کیوں خفا ہوں گا۔" وہ میری طرف دیکھ کر محبت سے بولے تھے۔

"واقعی آپ مجھ سے خفا نہیں؟" میں نے دوبارہ پوچھا تو انہوں نے میرے ہاتھوں کو پیار سے چومتے ہوئے گردن ہلا دی تھی۔

"اچھا آپ میرے لیے کیا دعائیں کرتے ہیں؟" میں نے لاڈ سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر پوچھا تھا اور وہ ہنستے ہوئے بولے۔

"تمہیں کیوں بتاؤں' یہ میرا اور میرے اللہ کا بڑا ہی پرسنل تعلق ہے۔"

زندگی میں پہلی بار وہ اس طرح مجھے پیار کر رہے تھے' کبھی میرے ہاتھ چومتے۔ کبھی ماتھے پر بوسہ دیتے' میں اس پل بہت خوش تھی۔ مگر مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ پہلی بار ہی آخری بار بھی ہے۔ مجھ سے باتیں کرتے کرتے انہوں نے آنکھیں موندی تھیں' میں نے خود ان کی دھڑکنوں کو خاموش ہوتے سنا تھا۔ میرے چیخنے پر سارا گھر وہاں جمع ہو گیا تھا۔

امی کے بعد اب ابی بھی۔ ایک ایک کر کے میرے اپنے مجھ سے چھنتے جا رہے تھے' فرحان بھائی کو تو مجھ سے کوئی سروکار نہیں تھا مگر ریحان بھائی کو میں نے ابی کے بعد اکثر اپنی شادی کی فکر میں مبتلا دیکھا۔

ریحان بھائی کو کاروبار میں خاصا بھاری نقصان ہوا تھا' جو پیسہ ڈوبا وہ قرض لیا ہوا تھا' قرض کی ادائیگی کے لیے فوری طور پر پیسے کی ضرورت تھی' انہیں الجھا الجھا اور پریشان دیکھ کر میں پریشان تو خود بھی ہو گئی تھی مگر پریشانی کا

سب مجھے ریحان بھائی اور فرحان بھائی کی کھانے کی میز پر ہونے والی گفتگو سے پتا چلا تھا۔ میں نے اپنے اکاؤنٹ میں موجود دس لاکھ روپیہ انہیں دیا تو وہ لینے سے انکاری ہو گئے تھے مگر میں نے زبردستی انہیں وہ چیک دے دیا تھا اور ایسا کر کے مجھے خوشی ہوئی تھی' کیا پتا اسی طرح آہستہ آہستہ بھائیوں کے دل میری طرف سے صاف ہو جائیں۔

ان ہی دنوں نجمہ بھابھی کے ایک کزن جو "ہیوسٹن" میں رہا کرتے تھے' پاکستان آئے۔ یہاں ان کے قریب ترین رشتے داروں میں نجمہ بھابھی ہی تھیں اس لیے وہ ہمارے ہی گھر قیام پذیر ہوئے۔ ان کی فضول گفتگو اور دولت کی غیر ضروری نمائش مجھے کوفت میں مبتلا کرتی تھی۔

وہ موصوف آئے بھی شادی کرنے کے ارادے سے تھے اور خاندان بھر میں ہونے والی ضیافتوں کو خوب انجوائے بھی کر رہے تھے۔ میری ان سے بہت واجبی سی سلام دعا تھی۔ انہیں لاؤنج یا ڈائننگ روم میں آتا دیکھ کر میں جلدی سے دوپٹہ سر پر ٹھیک کرتی تو وہ عجیب تمسخرانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر ہنستے۔ شاید اس خوف سے کہ کہیں ان کا امریکہ پلٹ کزن مجھے نہ پسند کر لے نجمہ بھابھی انہیں بارے میں سب کچھ بتا چکی تھیں۔

اس رات میں سونے کے لیے لیٹ چکی تھی جب کوئی میرے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ جل رہا تھا اور لیمپ کی روشنی میں میں آنے والے کا چہرہ فوراً تو نہیں پہچان پائی تھی مگر اٹھ کر ضرور بیٹھ گئی تھی۔ وہ سایہ ایک دو قدم آگے بڑھا تو میں گھبرا کر بیڈ سے اتر گئی تھی۔

"آپ کی ہمت کیسے ہوئی' بغیر اجازت میرے کمرے میں آنے کی۔" میں بغیر کسی لحاظ کے چلائی تھی۔ وہ بغیر ہچکچاہٹ یا گھبراہٹ کا شکار ہوئے واپس مڑ کر دروازہ لاک کرتا ہوا اطمینان سے بولا تھا۔

"میں جس جگہ سے آیا ہوں وہاں یہ بڑی عام سی بات ہے اور تمہارے لیے بھی یقیناً" یہ بات بڑی عام سی ہی ہو گی' پھر اتنا غصے میں آنے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں نے اس کے منہ پر کھینچ کر ایک بھرپور تھپڑ مارا تھا۔ اس کے ایک دم لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گرنے سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے شراب پی رکھی ہے۔ اس کی لڑکھڑاہٹ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے جلدی سے کمرے کا لاک کھولا تھا اور چیخ چیخ کر ریحان بھائی' فرحان بھائی کو آوازیں دی تھیں' ایک منٹ کے اندر اندر سب وہاں پہنچ چکے تھے' وہ مجھ سے ایسی کوئی توقع نہیں کر رہا تھا اس لیے بری طرح گھبرا گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" ریحان بھائی کو دیکھ کر مجھے ایک دم رونا آ گیا تھا۔ اپنے ہی گھر میں' میں اتنی غیر محفوظ تھی۔ ابھی میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ شیما بھابھی طنزیہ انداز میں بول پڑیں۔

"ہم لوگ سمجھتے تھے تم بدل گئی ہو مگر یہ تنا تو دور کی بات تم نے تو اپنے ہی گھر میں بھائیوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا شروع کر دی۔" میں ان کے اس الزام پر بلبلا اٹھی تھی۔ جب غلطی پر تھی تو چپ چاپ ہر الزام سہا تھا' خاموشی سے مار کھائی تھی مگر آج بنا قصور کے اتنا بڑا الزام سہنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ہے اگر آنکھوں میں دھول جھونکی ہوتی تو آپ لوگوں کو چیخ کر بلاتی نہیں۔" میں بلند آواز میں بولی تھی۔

"اور وہ تمہارے ہی کمرے میں کیوں آیا' مہتا کے کمرے میں کیوں نہیں چلا گیا؟" نجمہ بھابھی مجرموں کی طرح سر جھکا کر کھڑے ہوئے اپنے کزن کو دیکھ کر دانت پیستے ہوئے بولی تھیں۔

"صرف اور صرف تم دونوں کی وجہ سے۔" میں جنونی انداز میں شیما بھابھی اور ان کے برابر میں کھڑی نجمہ بھابھی کی طرف بڑھی تھی۔ "آخر میں نے تم دونوں کا بگاڑا کیا ہے۔" میں نے ہذیانی کیفیت میں شیما بھابھی کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔

فرحان بھائی ایک دم آگے بڑھے تھے اور انہیں میری گرفت سے چھڑوایا تھا مگر میں اسی جنونی انداز میں دوبارہ ان کی طرف بڑھی تھی۔ فرحان بھائی نے مجھے کھینچ کر روکتے ہوئے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا مگر میں نے بڑی بے خوفی سے ان کا ہاتھ روک لیا تھا۔ اس پل شاید میں اپنے آپ میں نہیں تھی۔

"ذلیل' بے غیرت۔" میرا ہاتھ جھٹکتے ہوئے انہوں نے تھپڑ مارا تو میں پیچھے کی طرف قدم اٹھاتی ہوئی بغیر روئے وحشت زدہ انداز میں چلائی تھی۔

"تم سب ذلیل ہو' بے غیرت ہو۔ اب اگر کسی نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گی۔"

"نکالیں اسے' چوری اور سینہ زوری' بجائے غلطی ماننے کے ہم پر چڑھ رہی ہے۔" وہ دونوں مل کر اپنے اپنے دلوں سے بول رہی تھیں۔

"تم لوگ مجھے کیا نکالو گے' میں خود تمہارے اس گھر پر تھوک کر جا رہی ہوں۔ پھر جب میں چلی جاؤں تو ایک ایک کو فون کر کے بتانا۔ تمہاری نند گھر سے بھاگ گئی ہے ایسی باتیں کرنے میں تو خوب ماہر ہو تم۔"

میں شیما بھابھی پر نظریں جما کر طنزیہ انداز میں ہنسی تھی اور سب کو نظر انداز کر کے واپس اپنے کمرے میں گھس گئی تھی۔ وہ سب خاموشی سے مجھ بے زبان کی اچانک چل پڑنے والی زبان سن کر سکتے کے عالم میں کھڑے تھے۔

اگر چار دیواری میں عزت محفوظ نہیں تو پھر کھلا آسمان کیا برا ہے' اگر دو کڑیل بھائیوں کی بہن کو اپنی عصمت کی حفاظت خود ہی کرنی ہے تو پھر ایسی جگہ رہا ہی کیوں جائے' ایک ہی بار یہ سوچ کر صبر کیوں نہ کر لیا جائے کہ میں اکیلی ہوں' مجھے اپنی حفاظت خود کرنی ہے۔

رات بھر میں اپنا سامان پیک کرتی رہی تھی۔ مجھے ایسا کرتے ہوئے بالکل بھی رونا نہیں آ رہا تھا' عجیب سی بے حسی نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

خالہ امی' میری امی کی سگی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ ایک ایسی غریب رشتہ دار جن کی امی ساری زندگی مالی امداد کرتی رہی تھیں۔ اس معاملے میں امی پر ابی کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں تھی' امی رشتہ داروں میں سے بہت سے لوگوں کی اور اس کے علاوہ بھی بے شمار لوگوں کی خفیہ مدد کیا کرتی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد ابی نے ان تمام لوگوں کی امداد جاری رکھی تھی' جب تک کہ محسن بھائی کی جاب نہیں لگ گئی' وہ وہاں پابندی سے پیسے بھیجتے رہے تھے۔

خالہ امی' امی اور ابی کی بہت احسان مند رہا کرتی تھیں۔ شاید احسان مندی ہی کے سبب وہ مجھ سے بھی بڑے پیار سے ملتی تھیں۔ ان کا پیار بھرا سلوک یاد آیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ میرے ماں باپ نے ان کے ساتھ بہت سی نیکیاں کر رکھی ہیں تو وہ ضرور مجھے اپنے گھر میں جگہ دے دیں گی' میں نے ان کے پاس چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اب ویسے بھی رہ کیا گیا تھا' کیا میں بیٹھ کر اپنے دھکے مار کر نکالے جانے کا انتظار کرتی۔

گھر سے نکلتے وقت جب میں ریحان بھائی کے پاس گئی تو انہوں نے مجھے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا تھا۔

"میں خالہ امی کے پاس پشاور جا رہی ہوں۔ آپ چاہیں تو فون کر کے کنفرم کر لیجیے گا کہ میں وہاں پہنچ گئی ہوں یا نہیں۔ ہو سکتا ہے میں کسی کے ساتھ بھاگ رہی ہوں اور آپ سے جھوٹ بول کر جا رہی ہوں۔ میں اب آپ لوگوں کو ستانے واپس نہیں آؤں گی' آپ لوگ چاہیں تو سب سے کہہ دیجیے گا کہ زوبیہ ہمیشہ کے لیے کہیں چلی گئی ہے یا مر گئی ہے۔ جو چاہیں کہہ دیجیے گا۔"

وہ اسی طرح منہ پھیرے بیٹھے رہے تھے' شیما بھابھی جو ان کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھیں' منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔

گھر سے باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اپنے گھر کو آخری بار جی بھر کر دیکھا تو بے حسی کی کیفیت یک لخت ختم ہو گئی تھی۔

گاڑی تیز رفتاری سے چل رہی تھی اور اس سے بھی زیادہ تیزی سے میری آنکھوں سے پانی بہہ کر میرا گریبان بھگو رہا تھا۔

اور سب کی طرح خالہ امی بھی میرے بارے میں سب کچھ جانتی تھیں' مگر انہوں نے پھر بھی مجھے اپنے گھر میں پناہ دے دی تھی' ماہ طلعت کی بیٹی ہونے کے ناتے' امی کے احسانوں کا بدلہ سمجھ کر۔ وہاں سب نے مجھے کھلے دل سے ویلکم کہا تھا۔ میں نے جاب کر لی' زندگی سکون سے گزرنے لگی تھی۔ میں نے خالہ امی کو اپنے آنے کی وجہ سچ بتا دی تھی اور انہوں نے میرے فیصلے کو درست قرار دیا تھا۔ وہ ریحان بھائی اور فرحان بھائی کو بھی اکثر برا بھلا کہا کرتیں' جن سے اپنی بہن اچھی طرح نہیں رکھی جا سکتی۔ مگر میرا یہ سکون اور اطمینان بہت تھوڑے سے دن برقرار رہ پایا۔

میری بد قسمتی ایک بار پھر پیچھا کرتے ہوئے وہاں آ پہنچی تھی۔ صرف ایک سال بعد میں دوبارہ گھر بدر کر دی گئی تھی۔ میں زندگی سے مایوس ہو گئی تھی' مجھے آنے والے وقت سے کوئی اچھی امیدیں نہیں رہی تھیں۔

پھر میری زندگی کا نیا دور شروع ہوا میں یہاں آ گئی۔ شروع شروع میں' میں یہاں بہت گھبرائی ہوئی رہی۔ مگر یہاں سب مجھ سے بڑے احترام سے ملتے ہیں۔

ان سب میں سے کسی کو بھی میری اصلیت پتا چل جائے تو سب کے رویے فوراً" بدل جائیں گے۔ میرا دنیا کی

کسی خوشی پر کوئی حق نہیں اور آپ جیسے اچھے انسان کی محبت کے تو میں ہرگز بھی قابل نہیں۔"

وہ اپنے سے چند قدموں کے فاصلے پر بیٹھی اس لڑکی کو بڑے دکھ سے دیکھ رہا تھا جس نے زندگی میں بے شمار دکھ اٹھائے تھے' جو بظاہر بہت کمزور اور بزدل لگتی تھی مگر اندر سے بہت بہادر تھی۔

"چلیں زوبیہ؟" کافی دیر بعد وہ بولا بھی تو کیا بولا تھا۔ وہ گھٹنوں پر سے سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل نہیں ہوئے تھے۔ نگاہیں بدلی ہوئی نہیں لگ رہی تھیں مگر ہونٹوں پر چپ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ وہاں سے اٹھتے وقت اس نے محسوس کیا کہ اس شخص کا بدل جانا وہ سہہ نہیں پائے گی' اگر یہ شخص بھی بدل گیا اسے چھوڑ گیا تو اب کی بار شاید وہ واقعی مر جائے۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ بھی کسی کے آگے نہیں کھلی تھی۔ اس کی کوئی دوستیں نہیں تھیں' کوئی رازدار نہیں تھا' زندگی میں پہلی بار اس نے کسی کو اپنی ہر سوچ اور اپنی ہر بات بتائی تھی اور اس شخص کے آگے کتاب زندگی کے اوراق پلٹنے پر اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ اس نے ایک دم خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔

خجستہ کی موت کے بعد سے جس سکتے کی کیفیت میں وہ مبتلا تھی' وہ کیفیت یکسر ختم ہو چکی تھی۔ ڈیوٹی آف ہونے کے بعد وہ خجستہ کے گھر چلی آئی تھی۔ اتنے دنوں بعد جب آج وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئی تھی تو اسے احساس ہوا کہ ابھی اس پر ایک قرض باقی ہے' خجستہ کے خون کا قرض۔ کیا اس معصوم کا خون رائیگاں چلا جائے گا۔

اسے پورا یقین تھا کہ خجستہ کی ساس اور شہباز اس معاملے میں اس کا ساتھ دیں گے' اسے دیکھ کر ان دونوں نے بجھے دل سے خوش آمدید کہا تھا۔ خجستہ کی موت ان دونوں کے لیے بہت بڑا سانحہ تھی۔ اس نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو وہ دونوں ہی بوکھلا گئے تھے۔

"ہم لوگ پولیس کو بیان دے چکے ہیں کہ گولی غلطی سے پستول صاف کرتے ہوئے چل گئی تھی۔" شہباز ہچکچاتے ہوئے بولا تھا۔

"کوئی بات نہیں' بیان بدلا بھی جا سکتا ہے' سچائی تو بہرحال سچائی ہے۔ تم لوگ سچ بولو' دیکھو ہم سب کو اللہ کو بھی منہ دکھانا ہے' ایک مظلوم لڑکی کا خون تم لوگوں کی گردن پر بھی ہو گا۔ وہ ان دونوں کے چہروں [illegible] پڑھتے ہوئے جھنجلائے ہوئے انداز میں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اپنا گھر پورا اجاڑ دیں۔ بہو مر گئی اور بیٹے کو خود پھانسی کی سزا دلوا دیں' ہم ایسا نہیں کر سکتے۔" اس کے سمجھانے اور کہنے سننے پر بھی وہ دونوں کوئی بات ماننے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے۔

"ٹھیک ہے میں آس پڑوس والوں سے بیان دلواؤں گی' جب پاس پڑوس والے پولیس کو یہ بتائیں گے کہ بہادر' خجستہ پر بہت ظلم کرتا تھا' اسے مارتا پیٹتا تھا' جب پولیس کو یہ سب پتا چلے گا تو وہ خود تم دونوں کے پاس دوبارہ آئے گی اور پولیس کو تم لوگوں سے سچ اگلوانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔"

وہ ان دونوں کو دھمکاتی وہاں سے نکل آئی تھی مگر جب وہ ارد گرد کے گھروں میں اس مقصد سے گئی تو اسے پتا چلا کہ یہ سب اتنا سہل نہیں جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ اس کی بات سنتے ہی برابر والے مکان میں رہنے والے خان محمد نے جب یہ کہا۔

"انہیں تو اتنے سالوں میں کبھی بہادر اور خجستہ کی کسی لڑائی جھگڑے کی کوئی آواز نہیں آئی' وہ دونوں تو بہت محبت سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ کبھی بہادر کے ہلکا سا چلانے تک کی آواز انہوں نے نہیں سنی۔" تو وہ اسے اتنے تحکم لہجے میں جھوٹ بولتا دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ جن گھروں کے مردوں سے بات ہوئی' ان سب نے تو واضح طور پر یہی جواب دیا تھا کہ کبھی خجستہ کے رونے یا چیخنے کی کوئی آواز انہوں نے نہیں سنی اور جن گھروں میں عورتوں سے بات ہوئی اور انہیں اس نے جذباتی انداز میں سچ بولنے پر اکسانے کی کوشش کی تو وہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگیں۔

"یہاں عورتوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے' میری بہن کو تو اس کے شوہر نے جلا کر مار دیا تھا' ہم سب کو پتا تھا مگر مردوں کے خلاف ہم عورتیں کچھ بول سکتی ہیں؟ میرا آدمی خود مجھے بہت مارتا ہے' تو کیا میں پولیس کے پاس پہنچ جاؤں۔" وہ کسی کو بھی قائل نہیں کر پا رہی تھی۔

خجستہ کے لیے دل میں بہت ساری ہمدردی رکھنے کے باوجود کوئی ایک بھی اس کے حق میں گواہی دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اسے تھوڑی بہت سزا ہو گی اور پھر تھوڑے دنوں بعد وہ دوبارہ یہیں اسی جگہ دندناتا پھر رہا ہو گا۔ پولیس کو کچھ دے دلا دیا تو شاید معاملہ بہت ہی آسانی سے رفع دفع ہو جائے گا۔ وہ پاس کے گاؤں کے سردار کا خاص کارندہ تھا اور اتنا بے اختیار اور لاچار نہیں تھا کہ خود کو بچا نہ سکتا ہو۔ سچائی اپنی تلخ ترین حیثیت میں کھل کر سامنے آئی تو وہ تھرا گئی تھی۔

"آپ ابھی کیا جانتی ہیں ڈاکٹر زوبیہ! ہمارے اسی معاشرے میں عورتیں جلا کر ماری جاتی ہیں' یہ چولہے پھٹنے کی خبریں تو آپ نے اخباروں میں ضرور پڑھی ہوں گی' کبھی کم جہیز لانے پر' کبھی اولاد نہ ہونے پر' کبھی لڑکیاں پیدا کرنے پر۔ ہمارے اسی معاشرے میں عورتیں کاری کی جاتی ہیں۔ اگر آپ نے اس معاملے کو آگے بڑھانے کی کوشش کی' اس حادثے کو قتل ثابت کرنا چاہا اور چلیں مان لیا کہ قتل ثابت ہو جاتا ہے' پھر آپ کا مخالف وکیل بہادر کی طرف سے خجستہ کے کردار پر حملہ کرے گا۔ وہ آوارہ تھی' بدچلن تھی' بدکردار تھی' اس کے اپنے دیور کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے اور کیا ایک غیرت مند شوہر ایسی صورت میں بیوی کو جان سے نہ مار دیتا' اسے ضرور ایسا ہی کرنا چاہیے تھا کیونکہ غیرت سے بڑھ کر مرد کا اور کیا ہو سکتا ہے۔"

وہ بڑی بے رحمی سے کڑوی سچائیاں بیان کر رہا تھا۔ زوبیہ آنکھوں میں آنسو لیے خاموشی سے اس کی زبان سے نکلتے تلخ حقائق سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہو گیا تھا۔

شکست خوردہ اور نڈھال وہ ہاسپٹل پہنچی تو بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ اسفند یار سے ملے' اس سے کہے کہ مجھے تسلی دو' کوئی ایسی بات کرو کہ میرے بے قرار دل کو قرار آ جائے۔

ریسپشن سے پتا کیا تو پتا چلا کہ وہ کل اور آج سرے سے ہاسپٹل آیا ہی نہیں تھا۔

"اسے کچھ ضروری کام تھا' کہہ رہا تھا وہ تین روز کے لیے آؤٹ آف اسٹیشن ہوں۔" ڈاکٹر شنوز نے اس کے استفسار کے جواب میں فائل پر سے نظریں اٹھا کر جواب دیا تھا۔ "تمہیں کچھ کام تھا اسفند سے۔" معاً انہیں دھیان آیا تھا۔

"نہیں۔ ایسا کچھ خاص کام نہیں تھا۔" وہ بوجھل دل لیے ان کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

"اتنی جرأت تو آپ میں ہونی چاہیے تھی ڈاکٹر اسفند یار خان کہ اگر میری سچائی جاننے کے بعد آپ اپنی محبت سے دستبردار ہو گئے ہیں تو یہ بات آپ کو میرے منہ پر کہنی چاہیے تھی۔ رات کے اس پہر وہ چپ چاپ ہاسٹل کی ٹھنڈی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ سامنے ہاسپٹل کے پچھلے دروازے سے نکل کر دو ہیولے باغ کی طرف بڑھے تھے' وہ اماوس کی رات تھی' گھپ اندھیرا' گارڈن لائٹس بھی اکا دکا ہی جلی ہوئی تھیں' رات کے اس پہر آنے والوں کو اس تک پہنچنے کی جلدی بھی بہت تھی' وہ دونوں بہت تیز تیز اس کے پاس آ رہے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

"میں اسفند یار خان ہوں۔" اس شاندار آفس میں بیٹھے بلیک سوٹ میں ملبوس پختہ عمر کے مرد سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے اپنا تعارف کروایا تھا۔

"تشریف رکھیے۔" انہوں نے بڑی رسمی اور پروفیشنل قسم کی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر اسے سیٹ آفر کی تھی۔ ان کے مزید کوئی بات کہنے یا کچھ دریافت کرنے سے پہلے ہی وہ بول پڑا تھا۔

"آپ زوبیہ خلیل کو جانتے ہیں' آئی مین ڈاکٹر زوبیہ خلیل کو؟" وہ ایک دم ٹھٹک گئے تھے وہ مستقل جواب طلب نظروں سے انہیں دیکھے جا رہا تھا۔

"آپ نے بتایا نہیں۔" وہ دوبارہ بولا تو انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"جی ہاں' وہ میری بہن ہے' آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟" اس نے محسوس کیا کہ بہن کا لفظ انہوں نے بہت اٹکتے ہوئے اور سوچ کر بولا تھا۔

"وہ میرے ہاسپٹل میں پچھلے ڈیڑھ سال سے جاب کر رہی ہیں' جاننے والی بات کا جواب تو یہ ہو گیا اور دوسرا سوال جو آپ یقیناً مجھ سے پوچھنا چاہ رہے ہوں گے کہ میں آپ کے پاس کس سلسلے میں آیا ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے رسم و رواج کے مطابق جب

کسی لڑکی سے شادی کرنی ہوتی ہے تو رشتہ لے کر اس کے سرپرستوں کے پاس جایا جاتا ہے' میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں' آپ اس کے بڑے بھائی ہیں اس لحاظ سے آپ ہی اس کے سرپرست ہوئے' چنانچہ میں آپ کے پاس چلا آیا۔"

وہ بڑے پرسکون انداز میں بول رہا تھا۔ اس کی بات سن کر ان کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"آپ کو اس سے شادی کرنی ہے' ضرور کریں' اس سلسلے میں میرے پاس آنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔" ان کے انداز میں لاتعلقی اور سرد مہری کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

"ایک بار اپنے دل میں جھانک کر دیکھیں کہ کیا واقعی آپ اس سے نفرت کرتے ہیں یا پھر یہ محض ایک جھوٹی انا اور نام نہاد غیرت ہے' جو آپ کو اسے لاتعلقی کا اعلان کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔" اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا تھا۔

"تو اس نے آپ کو اپنی وکالت کے لیے بھیجا ہے' آخر اسے اچانک ایسی کیا ضرورت آن پڑی بھائیوں اور سرپرستوں کی؟" وہ تمسخرانہ انداز میں اس سے مخاطب ہوئے۔

"وہ بہت اچھی ہے۔ بہت بہادر اور بہت سچی۔ اسے میری وکالت' صفائی' گواہی کسی چیز کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنی مرضی سے آپ کے پاس آیا ہوں' مجھے کسی نے یہاں نہیں بھیجا۔ اس جیسی اچھی لڑکی کی یہ بہت بڑی توہین ہوگی اگر میں کہیں اس کے لیے' رحم کی یا ہمدردی کی بھیک مانگنے جاؤں۔ میں تو بس یہ سوچ کر چلا آیا تھا کہ کیا پتا آپ اتنے سالوں میں کچھ بدل گئے ہوں' ہو سکتا ہے آپ خود بھی اسے یاد کرتے ہوں' شادی تو بہرحال مجھے اسی سے کرنی ہے' میں تو بس صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ لڑکی پوری عزت کے ساتھ اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہو۔"

اب کی بار وہ کچھ بھی نہیں بول پائے تھے' بس خاموشی سے اسے دیکھے چلے جا رہے تھے۔

"اور جس آزاد اور خود مختار زندگی کا آپ ذکر کر رہے ہیں' اسے وہ زندگی گزارنے پر مجبور کس نے کیا؟ کیا آپ نے اتنے برسوں میں کبھی یہ بات سوچنے کی زحمت کی' کوئی بھی انسان اپنا گھر خوشی سے نہیں چھوڑتا اور وہ پاگل لڑکی' وہ تو آج بھی اپنے اس گھر کو اور اس کے مکینوں کو یاد کر کے آنسو بہاتی ہے۔ وہ گھر جس میں اس نے آنکھ کھولی' جہاں اس کے ماں باپ کی یادیں ہیں' جہاں اس کے دو پیارے بھائی رہتے ہیں۔ آپ لوگوں کی اتنی بے تحاشا نفرت بھی اس کے دل سے آپ لوگوں کی محبت نہیں نکال پائی۔ آج بھی اپنے ریحان بھائی اور فرمان بھائی کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں' لیکن آپ کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئیں گی۔ میں اس کی کوئی وکالت کرنے نہیں آیا تھا' وہ جب کہیں غلط ہی نہیں ہے تو پھر اس کی طرف سے صفائی پیش کی جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تو صرف اس لیے' لیکن رہنے دیں اس بات کو' آپ کے نزدیک تو شاید یہ سستی جذباتیت ہو گی' بھائی کا بہن کو رخصت کرتے وقت سر پر ہاتھ رکھ کر خوشیوں کی دعا دینا سستی جذباتیت ہی تو ہے۔"

اس کے لہجے میں طنزیہ کاٹ کے ساتھ ساتھ بہت سے دکھ بھی ہلکورے لے رہے تھے۔

"کبھی وہاں میرے چھوٹے سے گاؤں میں آ کر دیکھیے ریحان خلیل صاحب کہ وہ لڑکی وہاں کتنی ہر دل عزیز ہے' اور سب کو خود سے پیار کرنے پر اس کے سلوک نے مجبور کیا ہے' آپ لوگوں کی اتنی ساری نفرتیں مل کر بھی اس کے دل سے محبتوں نہیں نکال پائیں' اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو خود پر اتنے الزامات سہتے سہتے تنگ آ کر آخر ایک روز یہ فیصلہ کر لیتی کہ ٹھیک ہے اگر میں بری ہوں تو پھر اب بری بن کر ہی دکھاؤں گی' انسانی نفسیات کی رو سے اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا' مگر اس نے ایسا نہیں کیا' پتا نہیں اتنی برداشت اور اتنا حوصلہ اس لڑکی میں کہاں سے آ گیا۔"

وہ گم صم سے بیٹھے ہوئے تھے' جبکہ وہ اپنی بات مکمل کر کے کرسی سے اٹھ چکا تھا۔

"یاد تو آپ اسے ضرور کریں گے ریحان خلیل صاحب! آج نہیں تو دس سال بعد' پندرہ سال بعد' کبھی نہ کبھی۔ آپ بھی اپنے ضمیر کی عدالت میں ایک روز جواب دہ ہوں گے' مگر تب شاید بہت دیر ہو چکی ہو گی۔ تب آپ کے پاس صرف ملال ہوں گے' پچھتاوے ہوں گے' بالکل اسی طرح جیسے آپ کے والد نے اپنی عمر کا آخری حصہ پچھتاووں کی نذر کر دیا تھا اور انہیں کس کس بات کا پچھتاوا تھا۔ زوبیہ

سمجھتی ہے انہیں بیوی سے برے سلوک پر ملال ہوتا تھا' بے شک انہیں اس بات پر بہت ندامت تھی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وہ خود کو اپنی اولاد کا بھی مجرم سمجھتے تھے۔ وہ یہ بات سمجھ چکے تھے کہ ان کی بیٹی سے جو غلطی ہوئی' اس کا سبب وہ خود ہی ہیں۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ ان سے حقوق العباد میں کوتاہی ہو چکی ہے' ان کی نمازیں اور ان کی عبادتیں کچھ بھی ان کے کام نہیں آئیں گی۔"

وہ اپنی بات ختم کرکے ایک پل کے لیے سانس لینے کے لیے رکا تھا۔

"معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کا بہت وقت برباد کیا' شاید میں نے آپ کے پاس آکر غلطی کی۔ بہرحال میری کوئی بات آپ کو بری لگی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں خدا حافظ۔" وہ ایک دم دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

ان کے ساکت وجود میں اچانک جنبش ہوئی تھی۔

"رک جایئے اسفندیار۔" وہ دروازہ کھولتے کھولتے ٹھٹھک کر رک گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥
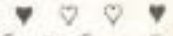
"اس کے قدم ایک بار بہکے تھے' وہ کم عمر تھی' نادان تھی' آپ لوگ چاہتے تو اس کی اس غلطی کو پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر معاف کر سکتے تھے۔ اپنی بیوی' بہن اور بیٹی کے معاملے میں ہر مرد اتنا ہی حساس اور غیرت مند ہوتا ہے جتنے آپ۔ لیکن وہ واقعہ جو صرف آپ کے گھر والوں کے درمیان تھا' اس کا چرچا سارے زمانے میں کس طرح ہو گیا' کبھی آپ نے اس بات پر غور کیا' اگر بات غیرت کی ہے تو غیرت تو یہ ہوتی کہ گھر کی بات گھر میں ہی دبالی جاتی۔ لوگ میرے گھر کے کسی فرد کو بیٹھ کر ڈسکس نہ کریں۔"

وہ ساحل پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے ان سے مخاطب ہوا تھا۔ "جن گھروں میں فیصلوں کا اختیار عورتوں کو دے دیا جائے' جن مردوں میں قوت فیصلہ کی کمی ہو' جو رشتوں کو ان کی صحیح جگہ پر نہ رکھ سکیں' بیوی کی کیا حیثیت اور مقام ہے' باپ اور ماں کا کیا مقام ہے اور بہن بھائیوں کی کیا جگہ ہے' وہاں اسی طرح کے پرابلمز کھڑے ہوتے ہیں۔"

اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے وہ خاموشی سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ غروب ہوتا سورج اپنی آخری شعاعیں زمین کی نذر کر رہا تھا۔

"شام کا یہ وقت دل کو اتنا اداس کیوں کر دیتا ہے؟" وہ ڈوبتے سورج کو دیکھتے ہوئے یاسیت سے سوچ رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی تیز لہر آکر ان کے پیروں کو بھگو دیتی تھی۔

"میں اس کی پچھلی زندگی کا احوال سن کر دنگ رہ گیا' ایک لڑکی اور اتنی بہادر۔ آپ میری بات کا یقین کریں ریحان صاحب! آپ کی بہن بہت بہادر ہے' اتنے سالوں سے وہ متواتر اور مسلسل اپنے کردار پر لوگوں کے شکوک و شبہات سہہ رہی ہے۔ وہ تمام گناہ اس سے منسوب کیے گئے جو اس سے سرزد بھی نہیں ہوئے تھے اور وہ پھر بھی زندگی کی جنگ لڑتی رہی کبھی ہاری نہیں' مایوس ہو کر کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھایا' مردوں کو تو خدا نے عورتوں سے زیادہ مضبوط اور قوی اعصاب کا مالک بنایا ہے' مگر میں نے ایک مرد کو اسی بات پر اپنی زندگی ہارتے دیکھا ہے اور وہ مرد کوئی عام مرد نہیں تھا۔ وہ جس کے قدموں کی دھمک سے زمین لرزا کرتی تھی۔ جو اتنا بہادر اور دلیر تھا کہ بڑے بڑے سورما اس کے آگے بھیگی بلی بنے کھڑے ہوتے تھے' جو بات کرتا تو اس کا لہجہ دو ٹوک اور قطعی ہوتا تھا اور ایسا شجاعت کا پیکر اپنے کردار پر حرف آتا دیکھ کر زندگی سے بڑی خاموشی کے ساتھ کنارہ کشی اختیار کر گیا تھا۔

جب میں زوبیہ کو بہادری سے زندگی کی جنگ لڑتا دیکھتا ہوں تو بے اختیار مجھے اردشیر خان یاد آجاتا ہے' میرا بڑا بھائی۔ وہ جو مجھے بہت پیارا تھا' باپ کے مرنے کے بعد سے میں اپنا باپ' بھائی' دوست سب کچھ سمجھنے لگا تھا۔ وہ ایک کامیاب وکیل تھا' بہت قابل اور ذہین اور اپنی ذہانت اور تمام تر طاقت وہ مظلوموں کی دادرسی میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس سے بہت اختلاف تھا۔ بی بی جان اور بھابھی بھی انہیں سمجھانے کی کوشش کرتیں کہ وہ کیوں خوامخواہ لوگوں سے دشمنیاں مول لیتے ہیں۔ مگر وہ راہ بدلنے کو تیار ہی نہ تھے۔

وہ ایک گینگ ریپ کا کیس تھا۔ کہانی وہی عام سی تھی' ایک غریب لڑکی جو بے تحاشا خوبصورت اور حیادار تھی اور مقابل امیر ماں باپ کے بگڑے ہوئے رئیس زادے۔ مخالف پارٹی اثر و رسوخ والی تھی ان کا وکیل شہر کا بہترین وکیل تھا تو مقابل اردشیر خان بھی کچھ کم نہ تھا۔ انہوں نے اسے خریدنے اور اپنے حق میں ہموار کرنے کی ہر ممکن حد تک کوشش کی مگر وہ اردشیر خان! اسے کیا کوئی خرید سکتا

تھا؟ تمام گواہیاں اور سارے ثبوت اردشیر لالہ نے ان لوگوں کے خلاف اکٹھے کر لیے' کیس ہر لحاظ سے ان کے حق میں تھا۔ مقدمے کا فیصلہ سنایا جانا باقی تھا' ان لوگوں کو کڑی سے کڑی سزا ملنے کی قوی امید تھی کہ اچانک سب کچھ بدل گیا۔ وہ جو عورتوں کے حق کی بات کر رہا تھا' ایک لڑکی کو بے آبرو کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہ رہا تھا خود اس پر بھی الزام لگ گیا۔

بکھرے ہوئے حلیے اور چیخ چیخ کر روتی واویلا کرتی اس لڑکی کو وہ اس روز سے پہلے جانتے تک نہ تھے۔ اپنے ہی آفس میں کھڑے وہ ایک ایک کو اپنا یقین دلانے اور اسے جھٹلانے کی کوشش کر رہے تھے' وہ بہترین مقرر' کامیاب وکیل' جن کے دلائل کے آگے کوئی ٹھہر نہیں سکتا تھا خود اپنے حق میں کوئی دلیل نہیں دے پا رہے تھے' سب ثبوت ان کے خلاف تھے' عینی شاہد موجود تھے' مظلوم لڑکی سب کے سامنے کھڑی رو کر اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی داستان سنا رہی تھی۔ میں ساری اطلاع پاتے ہی پاکستان واپس پہنچا تھا' بی بی جان اور بیتی بھابھی کا رو رو کر برا حال تھا' ہم سب کو ان کی بے گناہی کا یقین تھا' میں نے بہترین وکیل کا انتظام کیا تھا' انہیں حوصلہ دینے اور خود کو مضبوط رکھنے کا سبق پڑھاتا' انہیں ہر طرح یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ ہم سب ان کے ساتھ ہیں' مگر وہ اپنی بے گناہی ثابت کیے بنا موت کی آغوش میں چلے گئے۔ ان کے اس طرح خودکشی کر لینے پر بہت سے لوگوں کو ان کی بے گناہی کا یقین آیا' مگر بہت سے لوگوں نے یقین نہیں کیا۔

ان یقین نہ کرنے والوں میں میرے چچا کی فیملی سرفہرست تھی۔ میری بچپن کی منگیتر پلوشہ نے بھی اپنے دیگر گھر والوں کی طرح مجھ سے قطع تعلق کا فیصلہ کر لیا۔ ہم ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے' ہماری آپس میں بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی' مگر وہ بڑے آرام سے مجھ سے ہر رشتہ توڑ گئی تھی اس لیے کہ میں ایک بدکردار شخص کا بھائی تھا۔

میں زوبیہ کا اردشیر لالہ سے موازنہ کرتا ہوں تو وہ لڑکی مجھے اس مضبوط اور توانا مرد سے زیادہ بہادر محسوس ہوتی ہے' لیکن پھر بھی مجھے ایک ڈر سا لگا رہتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی طرح وہ ہمت ہار جائے' بہادری کے یہ سارے تمغے اتار کر کہیں وہ بھی کوئی بزدلانہ فیصلہ نہ کرلے۔"

انہیں اس کی آواز میں ہلکی سی نمی گھلی ہوئی محسوس ہوئی' بہت سے لوگ دور سے دیکھنے پر کتنے خوش باش اور مطمئن سے لگتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے انہیں تو کبھی کوئی غم چھو کر بھی نہیں گزرا ہوگا' قریب جا کر دیکھو تو پتا چلتا ہے کہ سچائی یہ نہیں۔ دنیا واقعی ایک آزمائش گاہ ہے۔

انہوں نے گردن موڑ کر اپنے سے بہت پیچھے رہ جانے والے اسفندیار کو بڑے دکھ سے دیکھا تھا۔ وہ خاموش کھڑا آتی جاتی لہروں پر نظریں جمائے جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اندھیرا ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ مگر وہ اس اندھیرے میں بھی روشنی پا رہے تھے' ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے انہیں گہری نیند سے بیدار کر دیا ہے۔

بہت سی یادیں تھیں' بہت سے ملال تھے اور ساتھ ہی آنسوؤں کی برسات تھی' جس نے وہاں موجود ہر چیز کو دھندلا دیا تھا' اس تاحد نگاہ پھیلے ہوئے سمندر کو بھی۔

"بھائی! ابی نے آپ کو بہت زور سے مارا ہے نا' آپ کو درد ہو رہا ہوگا' لائیں میں دوا لگا دوں۔"

وہ سترہ سال کا لڑکا باپ کو بتائے بغیر دوستوں کے ساتھ سینما فلم دیکھنے چلا گیا تھا اور گھر واپس آتے ہی باپ نے کھینچ کر دو تین تھپڑ اس کے منہ پر مارے تھے۔ باپ کے جاتے ہی وہ چھوٹی سی بچی آنکھوں میں آنسو لیے اس کے پاس آگئی تھی۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے وہ جانے اس کے چہرے پر کیا لگا رہی تھی' احساس توہین اور ذلت کے زیر اثر وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ مگر اس پل اس کے دل نے ایک بات محسوس کی تھی یہ کہ وہ چھوٹی سی بچی اس کی تکلیف پر اس سے بھی زیادہ افسردہ تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔

"کیا کر رہی ہو تم میرے کمرے میں؟" منظر بدل گیا تھا' اب وہ بچی ذرا بڑی ہو گئی تھی۔

"میں آپ کی وارڈ روب صاف کر رہی تھی' دیکھیں۔ میں نے آپ کے سارے کپڑے کتنی اچھی طرح سیٹ کیے ہیں۔" وہ بڑی محبت سے صاف ستھرے سمٹے ہوئے وارڈ روب کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں میری چیزوں کو ہاتھ لگانے کی جرات کیسے ہوئی۔" وہ غضب ناک انداز میں آگے بڑھا تو وہ آنکھوں میں حیرانی اور ڈر لیے دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"آئندہ میری کسی چیز کو ہاتھ لگایا تو ہاتھ توڑ دوں گا۔

گیٹ لاسٹ۔"

وہ دھاڑا تھا اور وہ سہم کر بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی مگر اس کی آنکھوں میں شکوہ صاف نظر آرہا تھا۔ باپ کے رویے سے بدظن ہو کر وہ دونوں بھائی گھر سے باہر سکون تلاش کرتے تھے۔ باپ کا رویہ بیٹوں کے ساتھ بھی حاکمانہ تھا۔ وہ بھی اس کی رعایا تھے مگر ان کے پاس گھر سے باہر ایک وسیع دنیا تھی۔ جہاں ان کے بہت سے دوست تھے بہت سی مصروفیات تھیں' ان کی زندگی اس چار دیواری تک محدود نہ تھی جو وہ کسی احساس کمتری کا شکار ہو جاتے یا تنہائی محسوس کرتے۔ ایسے میں انہیں کبھی اس لڑکی کا دھیان ہی نہیں آیا جو ان کی اکلوتی بہن تھی' جس پر زندگی ہر طرح تنگ تھی' ماں کے مرنے کے بعد وہ اور بھی تنہا ہو گئی اور خود وہ شادی کے بعد اپنی نئی زندگی میں بڑے مطمئن اور مگن ہو گئے۔

بچپن کی کتنی باتیں اور کتنے منظر ان کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہے تھے' جنہیں گزرتے وقت نے گرد آلود کر دیا تھا' آج جب ان یادوں سے گرد جھاڑی گئی تو ایک ایک منظر اس طرح یاد آتا چلا گیا جیسے یہ سب ابھی کل ہی کی بات تھی۔

ہاں اس سے غلطی ہو گئی تھی مگر اس کی غلطی سے بھی زیادہ بڑی غلطیاں تو وہ کرتے رہے تھے اور وہ بھی مسلسل۔ کبھی انہوں نے سکون سے بیٹھ کر یہ بات سوچنے کی کوشش کیوں نہ کی کہ گھر کے افراد کے مابین ہونے والی ایک بات کا تذکرہ سارے خاندان میں کس طرح ہو گیا' ساتھ رہتے انہوں نے کبھی اپنی بیوی کی بری عادتوں کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہ کی۔ بیوی کو بیوی بنا کر کیوں نہیں رکھا۔ اگر وہ غیرت مند تھے' عزت پر جان دینے والے تھے تو انہیں اس بات کو اپنے گھر سے باہر نکلنے سے روکنا چاہیے تھا' وہ ایک غلطی کے بعد بدل گئی تھی مگر آگے جو کچھ ہوا اس کے ذمہ داروں میں وہ سب سے آگے تھے۔ ابی اپنے پچھتاووں میں کھوئے اور وہ دونوں بھائی نام نہاد غیرت کا راگ الاپنے میں مصروف۔

"شیما بھابھی! بھائی کو سونے سے پہلے یہ دوا ضرور دے دیجیے گا۔"

وہ بظاہر بند آنکھوں سے اس کا پر تشویش لہجہ سن رہے تھے۔ کیسا عشق تھا اسے اپنے بھائیوں سے' جو اسے منہ نہیں لگاتے تھے' اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے' اس وقت ان کے دل میں اس کے لیے سوئی ہوئی محبت اچانک بیدار ہو گئی تھی۔

وہ اسے ابی کی دن رات ایک کر کے خدمت کرتے ہوئے دیکھتے۔ ابی سے لے کر اپنے بھتیجے بھتیجیوں تک وہ ہر ایک سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ سب کا خیال رکھنا جیسے اس پر فرض تھا اور وہ جواب میں اسے کیا دے رہے تھے۔ صرف نفرت' حقارت اور اس کے اپنے ہی گھر میں اسے تیسرے درجے کے شہری جتنے حقوق۔

وہ اپنے کلاس فیلو کا رشتہ آجانے پر چوروں کی طرح سب سے منہ چھپائے پھر رہی تھی۔ کیا اس کاٹتے برسوں کا زندگی گزارنے کا ڈھنگ ان لوگوں کے سامنے نہ تھا۔ انہوں نے کبھی یہ بھی نہیں سوچا کہ اتنی محبت سے رشتہ مانگنے والے کبھی دوبارہ ان کے گھر کیوں نہیں آئے۔ ان کی آنکھوں سے گرنے والے تمام آنسو اس لڑکی کے نام تھے جسے وہ بہن کہتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ جس کے ساتھ تعلق اور وابستگی نے انہیں برسوں ندامت میں مبتلا کیے رکھا تھا۔

منظر پھر بدل گیا تھا اب وہ چیخ چیخ کر سب کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ فرہان کا ہاتھ بے خوفی سے پکڑ کر وہ چلا رہی تھی۔

"تم سب ذلیل ہو' بے غیرت ہو' تم لوگ مجھے کیا نکالو گے میں خود تمہارے اس گھر پر تھوک کر جا رہی ہوں۔"

وہ چپ چاپ تماشائی بنے کھڑے رہے تھے' حالانکہ اس لمحہ ان کے دل نے اس کے حق میں گواہی دی تھی مگر وہ دل کی بات سننے پر آمادہ ہی کب تھے' وہ بھائیوں کے ہوتے بے امان ہو گئی تھی۔

"میں اب آپ لوگوں کو ستانے واپس نہیں آؤں گی' آپ لوگ چاہیں تو سب سے کہہ دیجیے گا کہ زوبیہ ہمیشہ کے لیے کہیں چلی گئی ہے یا مر گئی ہے۔"

"ہم نے تمہیں جیتے جی مار ڈالا تھا زوبی! کبھی پلٹ کر دیکھنے بھی نہیں گئے کہ ہماری بہن کس حال میں ہے۔ یہ کیسی انا تھی' کیسی ضد' کس بات کا غصہ تھا۔"

وہ نڈھال سے ہو کر ساحل کی گیلی ریت پر بیٹھ گئے تھے۔ گزرا ہوا وقت واپس کس طرح لایا جا سکتا تھا' اب جب اپنی ہر غلطی نظر آنی شروع ہو گئی تھی تو دل کو اس ملال نے گھیرے میں لے لیا تھا کہ اپنی زیادتیوں کا ازالہ کس طور ہو۔

اپنے کندھے پر ہلکا سا دباؤ محسوس کر کے انہوں نے ڈبڈبائی ہوئی نگاہیں اٹھائیں تو اسفندیار اپنے برابر میں بیٹھا نظر آیا۔

"مجھ سے بہت بڑی زیادتی ہو گئی اسفندیار! اس گناہ پر تو مجھے شاید خدا بھی معاف نہیں کرے گا۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولے تھے۔ "مگر تمہیں پتا ہے' جس روز سے وہ گھر سے گئی ہے میں سکون کی نیند نہیں سویا۔ قدرتی نیند سوئے مجھے مدت ہو گئی اور اب تو خواب آور ادویات کے باوجود اکثر سوتے سوتے وحشت زدہ ہو کر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ مگر میں اسے کاروباری الجھن اور بڑھتی ہوئی عمر کا تقاضا قرار دے کر خود کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ ہاں تم ٹھیک کہہ رہے تھے واقعی ہمارا ضمیر ہمیں کچوکے لگاتا ہے' جب ہم کسی کے ساتھ ظلم کرتے ہیں تو وہ ہوا ب طلبی شروع کر دیتا ہے۔ ہم نہ سمجھنا چاہیں تو دوسری بات ہے۔"

وہ خاموشی سے اس اونچے پورے مرد کو بکھرتا اور روتا دیکھ رہا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔ خود سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے اس شخص کو حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ یہ بات ماننے کے لیے تیار نہ تھی کہ وہ حقیقت میں اس کے سامنے کھڑے ہیں۔ اسے لگا شاید وہ اب جاگتے میں بھی خواب دیکھنے لگی ہے۔ اسے اسی طرح گم صم کھڑے کی سی حالت میں بیٹھا دیکھ کر وہ بانہیں پھیلائے ایک قدم آگے بڑھے تھے۔

"زوبی! کیا تم مجھ سے ملو گی نہیں؟" یہ آواز کتنی جانی پہچانی سی تھی مگر لہجہ قطعاً "نامانوس۔ اتنی مٹھاس اتنی اپنائیت۔ وہ آہستگی سے اٹھی اور بیزاری سے قدم اٹھاتی ان کی طرف ایسے بڑھی جیسے اسے پتا تھا کہ اس کے آگے بڑھتے ہی وہ وہاں سے غائب ہو جائیں گے۔ مگر نہ وہ غائب ہوئے تھے نہ ہی وہ منظر تبدیل ہوا تھا۔ اس سے ایک قدم کے فاصلے پر اس کا بھائی کھڑا تھا اور اس کے پیچھے پرسکون انداز میں کھڑا وہ شخص مسکراتی نگاہوں سے اس کی سمت دیکھ رہا تھا جسے وہ اپنے تمام کھوئے ہوئے رشتوں کی طرح رو چکی تھی۔ اپنے حساب سے جسے اس نے کھو دیا تھا۔

"بھائی!" چیخ کی صورت یہ لفظ اس کے منہ سے نکلا تھا۔ اگلے پل وہ ان کی بانہوں میں چھپی زار و قطار رو رہی تھی۔ اسے چپ کراتے کراتے وہ خود بھی رو پڑے تھے۔

"چلو زوبی! گھر چلو میں تمہیں گھر لے جانے آیا ہوں۔ تمہارا گھر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر انہوں نے بہت پیار سے کہا تھا۔ وہ آنسو بھری نگاہوں سے انہیں حیرت سے تکے جا رہی تھی۔

وہ اس کی آنکھوں میں لکھا ہر سوال بڑے آرام سے پڑھ سکتے تھے۔

"ہم لوگوں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ جو وقت گزر گیا وہ تو اب واپس نہیں آسکتا۔ میری جان! میں اپنی ہر زیادتی کا ازالہ کروں گا۔"

اسفندیار بہن بھائی کے اس ملن پر گہری طمانیت محسوس کرتا خاموشی سے مسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔ ساری رات جاگ کر وہ دونوں آپس میں بہت سی چھوٹی

چھوٹی باتیں کرتے رہے تھے وہ باتیں جو انہوں نے کبھی بھی ایک دوسرے سے نہیں کی تھیں۔

اذان کی آواز پر وہ دونوں چونکے تھے۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے خوب صورت رات کی خوب صورت ترین صبح تھی۔

"جب ہم اللہ سے شکوہ کرنے میں دیر نہیں کرتے تو شکر ادا کرنے میں دیر کیوں کریں۔" وضو کرنے کے لیے جاتے ہوئے اس نے خود سے کہا تھا۔

وہ ہاسپٹل کے تمام وارڈز میں گھومتے وہاں کے ایک ایک فرد کے منہ سے اس کی تعریفیں سن رہے تھے۔ ہر شخص کے پاس اس کے حوالے سے کوئی نہ کوئی قابل ذکر بات موجود تھی۔ وہ لڑکی یہاں اتنی زیادہ چاہی جاتی تھی' حیرت کے ساتھ ساتھ انہیں عجیب سا فخر بھی محسوس ہوا تھا اس بات پر۔ یہاں ان کا حوالہ یہ تھا کہ وہ ڈاکٹر زونیہ خلیل کے بھائی ہیں اور اس حوالے سے وہ سب کے لیے انتہائی قابل احترام اور معزز مہمان تھے۔

وہ پہر میں ان لوگوں کی واپسی تھی اور جانے سے پہلے وہ ایک مرتبہ اسفندیار سے بات ضرور کرنا چاہتی تھی مگر اس سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل پا رہا تھا۔ پہلے وہ ریحان بھائی کو بی بی جان سے ملوانے لے گیا' وہاں سے واپس آکر بھی وہ اور ریحان بھائی سارا وقت ساتھ ساتھ رہے تھے۔ اس سے سامنا ہونے پر بس مسکراتے ہوئے اس کے سلام کا جواب دیا گیا تھا۔ جس شخص نے اس کی راہوں کے تمام خار اپنے ہاتھوں سے ہٹائے تھے' جس نے اسے اس کا کھویا ہوا مان لوٹایا تھا' اس کے وجود کو معتبر کروایا تھا کیا وہ جانے سے پہلے اسے شکریہ کا ایک لفظ تک نہ کہتی۔ مگر جانے کا وقت آگیا تھا اور وہ اسے کہیں پر بھی اکیلا ملا ہی نہیں تھا کہ وہ اس سے کچھ کہہ پاتی۔

"بولو کیا کہنا چاہتی ہو؟" وہ لوگ جانے کے لیے نکل رہے تھے' وہ آہستہ آہستہ چلتی سب سے پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ باقی لوگوں سے قصداً" تھوڑا پیچھے رہ گیا تھا۔ سب سیڑھیوں سے اتر کر پارکنگ کی طرف بڑھ گئے تھے' جبکہ وہ دونوں کوریڈور میں کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کے آمنے سامنے۔

"لیکن اس سے بھی پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے صرف ان دو دنوں میں میرے بارے میں اتنی منفی باتیں سوچ ڈالی تھیں؟ سچ سچ بتانا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا خفگی سے بولا یوں جیسے اسے یقین تھا کہ اس نے ضرور کچھ نہ کچھ الٹا سیدھا سوچا ہوگا۔

"آپ نے کچھ کہا جو نہیں تھا' کوئی بھی بات' کوئی تسلی۔" وہ شرمندگی سے سر جھکا کر اعتراف کر گئی تھی۔

"میں کچھ کہتا کیوں' عمل کیوں نہ کرتا۔ تمہارے پاس بیٹھ کر تمہارے آنسو صاف کرتا' تسلیاں دیتا کہ فکر مت کرو' سب ٹھیک ہو جائے گا' خود جا کر سب ٹھیک کرنے کی کوشش کیوں نہ کرتا۔ تمہیں پتا ہے ناں۔ مجھے تقریریں کرنا زہر لگتا ہے۔" وہ بڑے ناراض لہجے میں گویا ہوا تھا۔

"آپ نے میرے لیے اتنا کچھ کیا ہے کہ میں......"

اس کا مجھے سوں میں ادا کیا جانے والا یہ جملہ اسفندیار نے بڑی بے ساختگی سے درمیان میں ہی کاٹ دیا تھا۔

"اب خدا کے لیے تم یہ شکریہ' نوازش اور مہربانی قسم کے الفاظ بول کر میرا موڈ مت خراب کرو۔" وہ بڑی سنجیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "میں نے جو کچھ کیا وہ سب تو مجھے کرنا ہی تھا' تمہارے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے' میں نے جو بھی کیا صرف اور صرف اپنے لیے کیا ہے۔" وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ نہیں پائی تھی اور وہ اس کی حیران سی شکل دیکھ کر تھوڑا سا مسکرا دیا تھا۔

"ہو ناں بے وقوف' ایسے میری بات سمجھ میں تھوڑی آئے گی جب تک میں ایک لمبی چوڑی وضاحتی تقریر نہ کروں۔"

وہ آج اپنے بے وقوف کہے جانے پر اس سے ناراض نہیں ہو پائی تھی۔ وہ بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ گویا ہوا۔

"میں وہاں اپنے لیے گیا تھا۔ اس لیے کہ تمہاری عزت میری عزت ہے' تمہاری بے عزتی میری بے عزتی ہے۔ تمہاری خوشی میری خوشی ہے' تمہارا غم میرا غم ہے۔ لہٰذا یہ سب کچھ میں نے تمہارے لیے نہیں بلکہ اپنے ہی لیے کیا ہے۔ تم میرے منہ سے یہ جملے اس روز سننا چاہتی تھیں' میں نے تمہارے چہرے پر لکھی یہ خواہش پڑھ لی تھی کہ تم کوئی وعدہ' کوئی تسلی آمیز جملہ سننا چاہتی ہو۔ مگر اس روز یہ سب باتیں تم سے کہتے ہوئے میں اتنا اچھا

محسوس نہیں کر سکتا تھا جتنا آج کر رہا ہوں۔ اب یہ بولتے ہوئے مجھے ایسا نہیں لگ رہا کہ میں کھوکھلے لفظ ادا کر رہا ہوں۔" وہ بس خاموشی سے ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے اس کے ہاتھ بڑی محبت سے اپنے ہاتھوں میں لیے اور بہت مستحکم لہجے میں بولا۔

"وہ سب لوگ جو مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ میری عزت کرتے ہیں' انہیں تم سے بھی اتنا ہی پیار کرنا پڑے گا جتنا مجھ سے کرتے ہیں' تمہاری بھی اتنی ہی عزت کرنی پڑے گی جتنی میری کرتے ہیں۔ تم چاہو تو اسے میری طرف سے کوئی وعدہ سمجھ سکتی ہو' کوئی عہد کوئی پیمان۔" وہ پاس کھڑا اس کی آنکھوں میں جھلملاتے ستارے دیکھ رہا تھا جبکہ وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔

"تمہارے آنے کی خوش خبری میری امی نے برسوں پہلے مجھے دے دی تھی۔ امی! آپ نے بالکل سچ کہا تھا' واقعی ایسا شخص میری زندگی میں آچکا ہے جو مجھ سے صرف پیار ہی نہیں کرتا بلکہ میری عزت بھی کرتا ہے۔"

وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھے تھے۔ اسفندیار آہستہ آواز میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔

"اور یہ بھی یاد رکھو زونیہ! انقلاب کا نعرہ لگا دینے سے انقلاب نہیں آجاتا۔ اس کے لیے بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ مسلسل جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ تمہیں خجستہ کے مرنے کا دکھ ہے مگر یہاں مسئلہ صرف ایک خجستہ کا نہیں۔ ڈرائنگ رومز میں بیٹھ کر عورتوں پر ہونے والے مظالم پر دکھ کا اظہار کرنے سے' عورتوں کا دن منانے سے' ان کے حقوق کے لیے واک کرنے سے ان کے مسائل کبھی بھی حل نہیں ہو سکتے۔ ہم دن منانے اور جذباتی نعرے لگانے والی قوم ہیں' لیکن کسی کو تو عملی قدم اٹھانا ہی ہوگا اور وہ "کسی" "میں اور تم کیوں نہیں ہو سکتے۔ ہم اپنے اسی گاؤں سے ہی کیوں نہ شروعات کریں۔ جس طرح میں نے ہاسپٹل کا خواب دیکھا تھا' اسی طرح ہم یہاں ایک اسکول بھی تو بنا سکتے ہیں۔ لوگوں میں ان کے حقوق کے بارے میں شعور بیدار کرنے کی تھوڑی سی کوشش تو کر ہی سکتے ہیں۔ انہیں اچھائی برائی کا فرق سمجھا سکتے ہیں۔ ہماری یہ کوشش بہت چھوٹی بہت معمولی سی ہی سہی لیکن ہمیں یہ اطمینان تو ہوگا کہ ہم نے اچھائی کی طرف ایک قدم تو بڑھایا ہی ہے۔ کیا پتا یہ ننھا سا دیا آگے جا کر کتنے چراغ روشن کرنے کا باعث بنے' کیا پتا وہ صبح بہار آہی جائے' جب کوئی خجستہ ظلم کی چکی میں پستی اپنی جان سے نہ چلی جائے۔ میں کتابوں میں لکھی ہر بات سچ کرنا چاہتا ہوں۔ تم اس کام میں میرا ساتھ دو گی۔؟"

وہ پارکنگ کے پاس پہنچ گئے تھے۔ گاڑی کے پاس کھڑے سب لوگ ان ہی کے منتظر تھے۔

"ہاں' میں ہمیشہ آپ کا ساتھ دوں گی۔" اس نے صدق دل سے اسے اپنی وفاؤں کا یقین دلایا تھا۔

ڈاکٹر شہروز' ڈاکٹر آصف' شباب' تاجدار' سسٹر رضیہ سب لوگ اسے خدا حافظ کہنے ریحان بھائی کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔

"آپ کے جانے پر اصولاً" تو ہم لوگوں کو افسردہ ہونا چاہیے تھا مگر پتا ہے کہ یہ جانا عارضی ہے۔ اب ہو سکتا ہے کہ یہ ڈاکٹر شہروز کا پھیلایا ہوا کوئی پروپیگنڈا ہو مگر سننے میں یہی آیا ہے کہ آپ کچھ ہی دنوں میں واپس آجائیں گی۔ ہمیشہ یہیں رہنے کے لیے۔"

شباب نے بڑی شوخ سی مسکراہٹ سمیت اسے مخاطب کیا تھا۔ اس بات پر اس کے پیچھے کھڑا اسفندیار بھی ہنس پڑا تھا۔

"ڈاکٹر شہروز نے آپ کو بالکل ٹھیک بتایا ہے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے اعتراف کیا تو وہاں موجود سب ہی لوگ ہنس پڑے تھے۔ سب کو خدا حافظ کہتی وہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ گاڑی لمحہ بہ لمحہ اس چھوٹے سے گاؤں سے دور ہوتی چلی جا رہی تھی مگر وہ وہاں سے دور جانے پر بالکل بھی اداس نہیں تھی۔ اسے پوری عزت اور چاہت کے ساتھ واپس یہیں آنا تھا۔ جہاں وہ شخص اس کا بڑی شدت سے منتظر تھا جس سے مل کر اسے کتابوں میں لکھی ہر بات سچ لگنے لگی تھی۔ کچھ دیے جلاتے تھے' کچھ چراغ روشن کرتے تھے' کچھ ایسے کام کرتے تھے جنہیں کرنے سے ہی انسان' انسانیت کی معراج پر پہنچتا ہے۔